سازِ زندگی

میں نے اِس انداز سے چھیڑا ہے سازِ زندگی
خود عیاں ہونے لگا دُنیا پہ رازِ زندگی
چشمِ باطن سے نہاں وہ بھی نہ فرحت رہ سکا
لاکھ پردوں میں چھپا نغمہ نوازِ زندگی

مرتّبہ
کاشی ناتھ نہرو تنرا
اور
چھگن لال اروڑا

پبلشر
کاشی ناتھ مہروترا
بھیرون بھون سول لائن
کان پور

مئی سنہ ۱۹۴۲ء

پرنٹر
حکیم رمضان علی صاحب
اسرار کریمی پریس
جانسین گنج الہ آباد

نذر خلوص بخدمت جناب .... [illegible] صاحب جامعہ عثمانیہ

برائے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن



لالہ کیلاش پت سنگھانیا

عزیز کیلاش بابو

یہ معلوم ہے کہ ہم اور تم

کی گرہ

قائم رکھنے کیلئے ہی نذر یا انتساب کیا جاتا ہے

اور

یہ بھی حقیقت ہے کہ

چھوٹے اور بڑے کا معیار ظاہر کرنے

کیلئے ہی نذر یا تحفہ ہوتا ہے

لیکن

ایک دل کے لئے یہ سب فضول ہے، بیکار ہے

ہاں

میں تو اتنا ہی سمجھا ہوں کہ

میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو

کاشی ناتھ

دیباچہ

میرے دوست سری کاشی ناتھ بھردتراے کچھ دن ہوئے مجھے ایک خط بھیجا تھا جس میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ وہ اُردو کی کچھ ان غزلوں کو چُن کر جو انھیں پسند ہیں ایک کتاب کی صورت میں چھاپنا چاہتے ہیں۔ اور انھوں نے مجھ سے اس کی اجازت چاہی تھی کہ وہ میری بھی کچھ غزلیں اس کتاب کے لئے چُن لیں۔ اس بات کو بہت دن ہوئے۔ میں نے انھیں اجازت دے دی۔ اور میں اس بات کو بھول گیا۔ وہ اگلے زمانے سے لیکر آج تک کے اردو شاعروں کی غزلیں چُنتے رہے۔ کتاب تیار ہو گئی۔ آج یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ ناگری حرفوں میں بھی اور فارسی حرفوں میں بھی۔ دونوں میں الگ الگ نہایت خوبصورتی اور شان سے اور بڑی لاگت سے یہ کتاب چھاپی گئی ہے۔

جو لوگ صرف اُردو ہی جانتے ہیں وہ فارسی حرفوں میں اس کتاب کو پڑھیں گے اور اس میں کئی ایسی غزلیں پائیں گے جن سے ان کے دل اور دماغ پہلے بھی لُطف اُٹھا چکے ہیں۔ ان غزلوں کو پڑھ کر پرانی بہار پھر تازہ ہو جائے گی سُنے ہوئے راگ پھر

کانوں میں اور دل میں گونجنے لگیں گے ۔ سُنے ہوئے میٹھے سنگیت کے ساتھ
انھیں بہت سی ایسی غزلیں بھی ملیں گی جو بالکل نئی ہیں اور جن کا
رس اور سواد پہلے پہل انھیں ملے گا ۔ یہ کتاب ایسی
نہیں کہ ایک بار اس پر نظر ڈال کے اسے بھلا دیا جائے بلکہ یہ
کتاب ایسی ہے کہ گھر میں ، سفر میں ، بستی میں اور ویرانے میں ، یا
تنہائی میں اور دوستوں کی محفل میں ، برابر ہمارا ساتھ دے اور
ہم رہ رہ کر اس کا رس چکھتے رہیں اور مزہ اٹھاتے رہیں ۔

جو لوگ ہندی جانتے ہیں اور اُردو کم یا نہیں جانتے ہیں وہ
لوگ ناگری حرفوں میں اس کتاب کو پڑھکر اردو غزلوں کی بہار
لوٹیں گے ۔ شاید ہندی میں اُردو کی اچھی غزلوں کی کوئی کتاب
ابتک نہیں چھپی ۔ یہ کتاب بہت بڑی حد تک اس کمی کو پورا کریگی ۔
غزل اگر اچھی ہو تو وہ شاعری کا ایسا سُندر روپ ہے کہ زیادہ
سے زیادہ آدمی اس کی خوبصورتی کا آنند اُٹھاتے ہیں ۔ اب تو
بنگالی بھاشا میں گجراتی بھاشا میں اور شاید ہمارے دیش کی
کچھ اور بھاشاؤں میں بھی مزیدار اور رچی ہوئی غزلیں کہی جا رہی ہیں ۔
ہندی میں اگر ابتک بہت اچھی غزلیں نہیں کہی گئیں تو اس کی پوری
اُمید ہے کہ اب کہی جائیں گی ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا
چاہئے کہ سیکڑوں غزلیں اور غزل کے ہزاروں پد یا شعر اُس بھاشا
میں موجود ہیں جسے ہم رچی ہوئی ہندی کہہ سکتے ہیں ۔ اِسی کتاب کو

دیکھیے کہ فی صدی پانچ لفظ یا ٹکڑے ایسے ملتے ہیں جن کا مطلب بتانے کی ضرورت پڑی ہو۔

غزل کئی طرح کی ہوتی ہے۔ مگر اچھی غزل وہی سمجھی جاتی ہے جس کی بھاشا بہت کم مشکل ہو، ہلکی پھلکی ہو، نرم اور نازک ہو، رسیلی ہو، بھاو سے بھری ہوئی ہو، جس کی بھاشا میں الجھاؤ نہ ہو، موٹے بھاری مشکل لفظ نہ ہوں، جس میں صفائی ہو، روانی ہو، بھاشا خوبصورت اور سلجھی ہوئی ہو، جس میں ہماری بولی ٹھولی کا مزا ہو اور جس کے بھاو اور وچار میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کا مزا آئے۔ اور اس سب کے ساتھ سنگیت بھی ہو۔

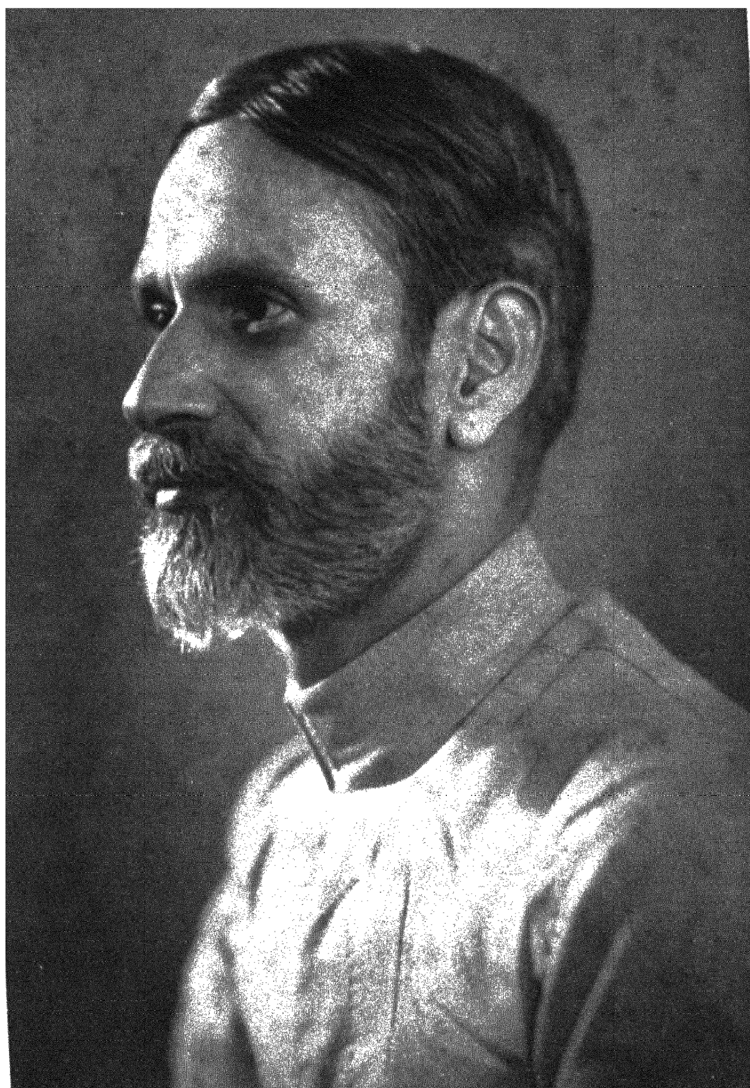
غزل میں پریم اور سندرتا، عشق اور حسن کی باتیں ہوتی ہیں سامنے کی باتیں، آئے دن کی باتیں، اوپر کی باتیں کچھ گہری باتیں اور بہت گہری باتیں کچھ اونچی باتیں اور بہت اونچی باتیں۔ روپ رنگ کی باتیں، دیکھنے سننے کی باتیں اور روپ رنگ سے پرے کی باتیں ان دیکھی اور ان سنی باتیں بھی۔ یہاں تک کہ جنسی یا روحانی محبت سے گزر کر جیون اور سنسار کے گہرے اور نازک پہلو بھی غزل میں اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ یوں تو غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے الگ ہوتا ہے لیکن ہوتے سب شعر پریم، سندرتا اور جیون ہی کے اوپر۔ ساقی، مینخانہ، ہوش بیخبری، جنوں وحشت، بہار، بلبل، کارواں، منزل، ایسے

سیکڑوں رُوپک یا ایسی سیکڑوں تمثیلیں محبت اور زندگی ہی کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالنے اور اُسے اجاگر کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔

ان غزلوں کو میں نے نہیں چُنا ہے۔ بابو کاشی ناتھ مہروترا نے اپنی پسند کے مطابق چُنا ہے۔ میں چُنتا تو بہت سی ان کی چُنی ہوئی غزلیں رکھتا بہت سی نہیں رکھتا اور ان کے بدلے دوسری غزلیں چُنتا۔ لیکن ان کا چناؤ بھی اچھا ہوا ہے۔ اب میں ان غزلوں کا مزا اُٹھانے سے آپ کو زیادہ دیر تک روکنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہ کہکر رخصت ہوتا ہوں کہ آپ ان غزلوں کو یا ان میں جو آپ کو پسند آئیں انھیں پڑھئے، گنگنائیے، اُنھیں اپنے کان اور دل میں گونجنے دیجئے، جہاں گہرے شعر ملیں ان میں ڈوب جائیے اور سیکڑوں طرح سے ان غزلوں کا مزہ اُٹھائیے۔

رگھوپتی سہائے فراق
گورکھپوری

الہ آباد یونیورسٹی
۲۴ مئی سنہ ۱۹۴۲ء



کاشی ناتھ میسرونزا

کیوں؟

چونکہ مجھے کچھ گانے بجانے کا شوق عرصے سے ہے اسی سلسلہ میں کچھ مجموعہ غزلیات وغیرہ کا تیار ہو گیا۔ جس کو کہ دوست احباب نے کافی پسند کیا اور انھیں لوگوں کے اصرار پر کتابی شکل دی گئی جو صرف دوستوں کو نذر کرنے کیلئے ہی سازِ زندگی کے نام سے چھاپی گئی ہے اس سے کسی قسم کا مالی فائدہ مقصود نہیں ہے جن شعرا نے خوشی سے اپنے کلام کے شمولیت کی اجازت دی اُن کا میں تہ دل سے شکر گذار ہوں اور جن کی اجازت کوشش کرنے پر بھی حاصل نہ ہو سکی ان سے معافی کا خواستگار ہوں اور مشکور بھی ہوں۔ میں لالہ کیلاش پت صاحب سنگھانیہ کانپور کا انتہائی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے اہتمام میں ہر طرح کی امکانی کوشش کی ہے۔

میں ڈاکٹر تارا چند صاحب پرنسپل کایستھ پاٹھ شالہ یونیورسٹی کالج الہ آباد اور جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری یونیورسٹی الہ آباد کا خاص طور پر شکر گذار ہوں جنھوں نے اس مجموعہ میں دلچسپی لی اور مختصر، مگر جامع و پُر مغز تمہیدوں سے کتاب کی رونق بڑھائی ہے۔

جن اصحاب نے اس انتخاب کی تکمیلیت میں مدد یا ہمّت افزائی کی ہے

اُن کے نام مندرجہ ذیل ہیں :-

بابو نرائن پرشاد اروڑا کانپور۔ رائے صاحب بابو سدھناتھ مہروترا کانپور۔ بابو بینی پرشاد ٹنڈن الہ آباد۔ بابو پرشوتم داس ٹنڈن الہ آباد۔ پنڈت بشمبھر ناتھ شرما کوشک کانپور۔ بابو کالی ناتھ کپور کانپور۔ بابو جے نرائن ٹنڈن کانپور۔ ڈاکٹر ایس۔ این مکرجی کانپور۔ ڈاکٹر بی۔ این مکرجی کانپور بابو پرشوتم داس مہروترا کانپور۔ پنڈت جیتندر منی شرما لکھنؤ۔ پنڈت رتن کمار مصر لکھنؤ۔ پنڈت بھارتیندو باجپئی لکھنؤ۔ بابو شیام کشور ٹنڈن کانپور۔ بابو بشوناتھ ٹنڈن کانپور۔ پنڈت شیام لال اگنی ہوتری کانپور۔ بابو راجیندر سنگھ گوڑ الہ آباد۔

میں ساہتیہ بھون لمیٹیڈ الہ آباد کو بھی نہیں بھول سکتا ہوں جس کے کارپردازوں نے اس کتاب کی چھپائی میں خاص طور سے دلچسپی لی ہے۔ باوجود ہر ممکن کوشش کے غلطیوں کے رہ جانے کا احتمال ہے۔ پھر بھی جو غلطیاں انجان میں رہ گئی ہوں اُن کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

کاشی ناتھ مہروترا

فہرست

رُباعیات

حقائق و معارف

تصوّف

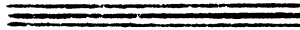
رندانہ

رنگ تغزل

ظرافت

متفرقات

نام شعراء	صفحہ



غزلیات

(۱)

غم والم کے سفینے کا ناخدا ہوں میں
قدم قدم پہ گماں ہے کہ ڈوبتا ہوں میں

جو گم ہوا ہوں تو حیرت کا آئینا ہوں میں
اب آپ اپنی نگاہوں میں پھر رہا ہوں میں

شبِ وصال پکارا تھا آپ نے مجھ کو
شبِ فراق اجل کو پکارتا ہوں میں

اسی کا نام ہے دِل اور اسی کا نام خیال
اِس ایک شکل میں ہر شکل دیکھتا ہوں میں

بھر آئے آنکھ میں آنسو تو حکم ضبط نہ دے
کہ اب پیالے کو لبریز کر چکا ہوں میں

میں جانتا ہوں کہ خاکِ آشیاں نہیں ہوتی
مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

سمٹتے جاتے ہیں غم سے نگاہ کے پردے
حجابِ ہستیٔ فانی اُٹھا رہا ہوں میں

حضرت آسی

(۲)

اسیرِ حسن ماہ و مہر تاباں ہو نہیں سکتا
میں اُس جلوے کا قایل ہوں جو پنہاں ہو نہیں سکتا

محبت ہے بہ ہر عنوانِ ہمت آزما لیکن
جسے تجھ پر یقین ہو وہ پریشاں ہو نہیں سکتا

ضرورت ہے ہر آنسو میں ہو خونِ دِل کی آمیزش
فقط پانی کی بوندوں سے چراغاں ہو نہیں سکتا

شریکِ آوازِ دردِ دِل نہ ہو جس کی صداؤں میں
ہمارے قافلے کا وہ حُدیٰ خواں ہو نہیں سکتا

مرے چہرے کی زردی اِک لپٹ ہے آتشِ غم کی
غمِ پنہاں کسی صورت نمایاں ہو نہیں سکتا

وہ چنگاری ہوں جو صد شعلہ افشاں ہو تہِ خرمن
فروزاں کر تو سکتا ہوں فروزاں ہو نہیں سکتا

مجھے افسوس ہے اُس مُدّعیِ آدمیت پر
کہ جو اِنساں نما ہو کر بھی اِنساں ہو نہیں سکتا

ہوئے ہم توڑ کر اِک پھُول مجرم کیا قیامت ہے
مگر گلچیں گنہگارِ گلُستاں ہو نہیں سکتا

محبّت کی خلش میں خبط ہے فکرِ سکوں مندی
یہ کانٹا دُور ہو سکتا ہے درماں ہو نہیں سکتا

میں رسماً اب سکونِ دِل کی اُس سے بھیک کیا مانگوں
جو میرے دِل میں رہ کر دِل کا درماں ہو نہیں سکتا

جنُوں پھُول اور کانٹے چھوڑ دوں یہ کیا قیامت ہے
ہوائے گُل میں اِتنا تنگ داماں ہو نہیں سکتا

وہ اے اعجازؔ عشرت مندِ جشنِ باغ کیا ہوگا
جو فرطِ کیف سے پھولوں پہ رقصاں ہو نہیں سکتا

حضرت اعجازؔ صدیقی اکبرآبادی

(۳)

راہِ طلب میں خاک نشیں اور بھی تو ہیں
واماندہ اک ہمیں تو نہیں اور بھی تو ہیں

دِل کیوں تڑپ رہا ہے اُسی کے خیال میں
اُسکے سوا جہاں میں حسیں اور بھی تو ہیں

کیا ہر جگہ ستم کا ہے چرچا اِسی طرح
ایسے ہی آسماں و زمیں اور بھی تو ہیں

فکرِ فراقِ دوست میں کھویا گیا ہے کیوں؟
سامانِ غم کے قلبِ حزیں اور بھی تو ہیں

پردہ اُٹھا کے محوِ تماشہ بنائیے
ورنہ جہاں میں پردہ نشیں اور بھی تو ہیں

اُٹھتی ہیں کیوں ہمیں پہ نگاہیں عتاب کی
محفل میں ہم جہاں ہیں وہیں اور بھی تو ہیں

اُمیدوارِ لطف و کرم اک ہمیں نہیں
پامالِ جورِ چرخِ بریں اور بھی تو ہیں

کرتا ہے کوئی ترکِ تمنّا تری طرح
آخگرؔ جہاں میں گوشہ نشیں اور بھی تو ہیں

نند کشور صاحب آخگرؔ بی اے ایل ایل بی فیروزپوری

(۴)

تمام عمر کٹی عرض و التجا کرتے
ہمیں تو شرم سی آتی ہے اب دعا کرتے

تُو دیکھتا کسی انداز سے اِدھر اِک بار
تری نظر سے ہم اندازۂ وفا کرتے

نہ ہوتے دِل سے نظر تک جو اسقدر پردے
کبھی کبھی تمھیں ہم دیکھ ہی لیا کرتے

زمیں سے تا بہ فلک ایک سا اندھیرا تھا
شبِ فراق ستارا شناس کیا کرتے

سمجھ لیا ہے کہ ہے احتیاط شیوۂ حسن
اگر کرم بھی وہ کرتے ستم نما کرتے

نظر اُداس، نفس سرد، رُوح پژمردہ
اب ایسے حال میں کیا چارہ گر دوا کرتے

ہمارے بس میں جو ہوتا تیرا غم پنہاں
تو ہم خدا کو بھی اس سے ناآشنا کرتے

رہے حجابِ نشیں یہ تو اغنیا میں تھا
مگر خیال کی وہ روک تھام کیا کرتے

ہوا نہ زحمتِ خاطر فریبِ عدۂ دوست
ہمیں یقیں ہی نہ تھا انتظار کیا کرتے

نوائے وقت نے آگے بڑھا دیا اعجاز
پڑے ہی رہتے جو تقلیدِ نقشِ پا کرتے

حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی

۵

کبھی اے حقیقتِ مُنتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

کبھی قبلہ رُو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

حضرت سر محمد اقبال

(۶)

تیر پہ تیر چلاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

برچھیاں تن پہ لگیں تیغ پڑیں تیر آئیں
آرزو مندِ اجل ہوں مجھے ڈر کس کا ہے

اُس کے دامن پہ گرا اشک جو میرا تو کہا
واہ کیا شوخ ہے یہ نورِ نظر کس کا ہے

دل کے سو ٹکڑے ہوں آ جائے کلیجہ مُنہ کو
ضبط ہے آہ نہ نکلے یہ جگر کس کا ہے

دل کبھی منزلِ حق ہے کبھی بُت کا مسکن
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے یہ گھر کس کا ہے

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے
سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے

تو ہی یاں رہنے کو آیا ہے نہیں او غافل
جو ہے دُنیا میں مُسافر ہے یہ گھر کس کا ہے

(۷)

دمِ اخیر ہے لازم نظارہ کر لینا
خدا سے کام پڑا ہے بتو خبر لینا

مریضِ غم کی عیادت کو جب ہوئے وہ سوار
کہا قضا سے کہ بڑھ کر ذرا خبر لینا

ہجوم ہوگا بہت جلوہ گاہِ حشر میں یار
اگر پہونچ نہ سکوں میں مری خبر لینا

نہ توڑ شام سے اے دِل شبِ فراق میں دم
ابھی تو رات ہی ساری پڑی ہے مر لینا

پڑی ہے دیر سے مٹّی خراب ہوتی ہے
لگا دو ہاتھ جنازے کو پھر سنور لینا

تڑپ کے مُنہ سے کلیجہ نکل پڑے نہ امیر
بہت جو درد اُٹھے دِل پہ ہاتھ دھر لینا

(۸)

زاہد شرابِ ناب سے جب تک وضو نہ ہو
قابل نماز پڑھنے کے مسجد میں تُو نہ ہو

پہلو سے دِل جُدا ہو تو کچھ غم نہیں مجھے
اے دردِ دل جُدا مرے پہلو سے تو نہ ہو

وہ گُم شُدہ ہوں میں کہ اگر چاہوں دیکھنا
آئینہ میں بھی شکل مری رُو برُو نہ ہو

شاخیں اُسی کی ہیں یہی جڑ ہے فساد کی
پہلو میں دِل نہ ہو تو کوئی آرزو نہ ہو

مسجد میں میں نے شیخ کو چھیڑا یہ کہہ کے آج
مَے لاؤں میکدے سے جوابِ وضو نہ ہو

ساری دمک چمک تو اِنھیں موتیوں سے ہے
آنسو نہ ہو تو عشق میں کچھ آبرو نہ ہو

حضرت امیر مینائی رح

۹

فانی ہے یہ دُنیا بھی ہر عیش بھی فانی ہے
عمرِ رواں کی قیمت کچھ ہے تو جوانی ہے

سرمایۂ ہستی ہے اِک خواب محبت کا
اور خوابِ محبت کی تعبیر جوانی ہے

پنہاں ہے پسِ پردہ صورت گرِ لافانی
تصویر کے پردے پر جو نقش ہے فانی ہے

خورشید کے مطلع پر آجائے شفق جیسے
خوں گشتہ اُمیدوں کے سایہ میں جوانی ہے

شمعِ سرِ محفل بھی سر دُھننے لگی احسن
اِک سوختہ قسمت کی کیا شعلہ بیانی ہے

حضرت احسن مارہروی

۱۰

سینے کے داغ دِل کو درخشاں نہ کر سکے
لاکھوں چراغ گھر میں چراغاں نہ کر سکے

خود داریوں کو ہم نے نثار اُن پہ کر دیا
وہ ہم پہ خود سری کو بھی قرباں نہ کر سکے

کہتے ہیں مفلسی کے چراغِ وفا ہے گُم
ہم خدّ و خالِ شوق نمایاں نہ کر سکے

بخشی ہی جس نے ہم کو پریشانئ دوام — ہم اس کو ایک دن بھی پریشاں نہ کر سکے

ُس بدنصیب کو غمِ دوراں کہاں نصیب — جو چارہ سازئ غمِ دوراں نہ کر سکے

شِ جنوں میں دامنِ ہستی ہے تار تار — حسرت نہیں کہ چاک گریباں نہ کر سکے

احسان اِتنا تلخ جوابِ وفا مِلا

ہم اس کے بعد پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

حضرت احسان بن دانش

۱۱

ب وہی ہم ہیں کہ فریاد کیا کرتے ہیں — اِک زمانہ تھا جسے یاد کیا کرتے ہیں

ب اسیروں کو نہیں رہتی رہائی کی ہوس — ایسی حالت ہیں وہ آزاد کیا کرتے ہیں

ب تو کچھ عرش کے آگے ہے تصوّر اپنا — اِک جہاں اور ہم آباد کیا کرتے ہیں

ٹوٹ کر رہ گیا نشتر ہی رگِ جاں میں اثر

کیا یوں ہی خاطرِ فصّاد کیا کرتے ہیں

۱۲

کوئی ویرانہ مثالِ دل کہاں — اور مجھ دیوانے کی منزل کہاں

یہ تغیّر آشنا ہے ہر نفس — چند فرضی خط سمجھ ساحل کہاں

تیری یکتائی میں ہرگز شک نہیں — تو جہاں ہے پھر وہاں محفل کہاں

لوٹ لی غم نے متاعِ آرزو

اُجڑی اِک منزل اثر ہی دل کہاں

۱۳

بیدادِ دوست کس سے کہوں ہم نفس نہیں — فریاد کیا کروں کوئی فریاد رس نہیں
آ دیکھ ضبطِ گریہ نے موتی پروئے ہیں — سینے میں ایک سلکِ گہر ہے نفس نہیں
دونوں جہاں سے عشق نے بیگانہ کر دیا — اب کوئی آرزو نہیں کوئی ہوس نہیں

محرومیٔ جفا کا گلہ کیا کرے اثرؔ
دِل اُس کو دیدیا جب کچھ دل سے بس نہیں

۱۴

قیس کے نزدیک لیلیٰ پردۂ محمل میں ہے — کون دیوانے کو سمجھائے کہ تیرے دِل میں ہے
رُوح کا قالب میں آنا کہہ رہا ہے صاف صاف — رازِ دریا کی روانی کا نہاں ساحل میں ہے
اُسکی رحمت نے کہا جو مانگنا ہو مانگ لے — میری غیرت بول اُٹھی تو ہی دِلِ سائل میں ہے
جسقدر نزدیک ہوں اُتنا ہی اُس سے دُور ہوں — ایسی مشکل ہے کہ خود مشکل مری مشکل میں ہے

راستے کی سختیوں کا تم کو رونا ہے اثرؔ
خارزارِ عشق میں مشکل جو ہے منزل میں ہے

۱۵

دورِ ضعف میں ہی سامنا مشکل ہی مشکل کا — اُٹھانا اِک قدم کا مجھکو طے کرنا ہے منزل کا
میں وہ کشتی شکستہ ہوں کہ جس کو ٹکر دیتی ہیں — حوادث نے بنایا ہے نشانہ موجِ ساحل کا
ہزاروں زینتوں سے ہوگئی آراستہ محفل — پتہ ملتا نہیں لیکن کسی کو میرِ محفل کا

قفس میں دل پھڑکتا ہے اثرؔ جب یاد آتا ہے
قریب اپنے نشیمن کے پھڑک اُٹھنا دِل کا

۱۶

دورِ ساغر جو کسی بزم میں چلتے دیکھا　چشمِ نیرنگ کو سو رنگ بدلتے دیکھا

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی　کچھ انھیں سے دلِ دیوانہ بہلتے دیکھا

جس کے تلووں سے آنکھیں ملتے رہے ہم آنکھیں

اُس کو افسوس کلیجہ ہی مسلتے دیکھا

۱۷

آیا جہاں میں کس لئے میں کیا بتا کیا ہوا　بھولا ہوا خیال ہوں نقشہ مٹا ہوا

کیا دن تھے جبکہ داغِ جگر بھی تھے شعلہ ریز　اب دل ہے یا چراغِ سحر ہے بجھا ہوا

چھیڑا جو میں نے قصۂ سوزِ غمِ فراق　خورشید حشر ڈوب گیا کانپتا ہوا

کیا روئے پھوٹ پھوٹ کے تارے تمام رات　دیکھا جو آبلہ مرے دل کا بھرا ہوا

میں گلفروشِ سینۂ صد چاک ہوں اثر

آہِ سحر میں خون ہے دل کا ملا ہوا

۱۸

مرے دل میں چھپ چھپ کے آنے لگا　وہ پردے میں جلوہ دکھانے لگا

برا ہو ترا بیکسی بیکسی!　مجھے خاک سے وہ اٹھانے لگا

وہ گذرا ادھر سے جو بیگانہ وار　چراغِ لحد جھلملانے لگا

بہت رازِ الفت چھپایا اثر

مگر رنگ اُڑ کر بتانے لگا

۱۹

رات کو سینہ اسقدر کوٹا — ایک تارا سا عرش سے ٹوٹا
پتّہ پتّہ ہے مظہرِ قدرت — شاہدِ حق پسند ہر بوٹا
شوق نے چھین لی متاعِ خرد — دِل کو تیرے خیال نے لوٹا
اِن بتوں کا ہے عہد جب سے اثر
جھوٹا سچّا ہے سچّا ہے جھوٹا

حضرت اثر لکھنوی

۲۰

دِل ہر نفس پہ شعلہ بداماں ہے اور ہم — یہ عاشقی کی منزلِ آساں ہے اور ہم
آخر نگاہِ شوق کا ہے سدِّ راہ کون — سارا نگارخانۂ اِمکاں ہے اور ہم
وہ چاک ہو رہا ہے سراپردۂ حبیب — یہ وہم تھا کہ اپنا گریباں ہے اور ہم
آخر تجلیاتِ محبت عیاں ہوئیں — پھر دِل کسی کا دیدۂ حیراں ہے اور ہم
اے ناشناسِ لذّتِ آزارِ عاشقی — ہاتھوں میں چارہ گر کا گریباں ہے اور ہم
گرتی ہے برق اُٹھتے ہی اسعد نگاہِ شوق
اب تک حجاب غیرتِ جاناں ہے اور ہم

۲۱

شاد ہے یوں دِل فریبِ عالمِ اسباب پر — جیسے ہو کوئی سفینہ رقص میں گرداب پر
حسرتِ ناوک نگاہی، یادِ مژگانِ دراز — دل نے خود کانٹے بچھائے ہیں بساطِ خواب پر
کاٹنا ہے دیدۂ گریاں شبِ ہجرِ دراز — خون سے گلکاریاں کر چادرِ مہتاب پر

سُن تو لے فریاد و شیون دل کو ٹھکرانے کے بعد — کتنے نغمے ہیں بپا اِک جنبشِ مضراب پر
سوزِ دل میں ہو تو پھر جذب و اثر مشکل نہیں — ٹوٹ پڑتے ہیں پتنگے شعلۂ بیتاب پر

رہگزارِ عشق میں اسعدؔ یہ دل کا حال ہے
اِک سفینہ جا رہا ہے آگ کے سیلاب پر

۲۲

منظرِ فانی ہے اے غافل اسے پیہم نہ دیکھ — دیکھ لیکن یوں بہارِ گلشنِ عالم نہ دیکھ
پُر سکوں تہ میں خزانہ موتیوں کا ہے نہاں — سطحِ دریا پر حُباب و موج کا عالم نہ دیکھ
اِس گلستاں میں بسر کرتے ہیں یونہی زندگی — خندۂ گُل پر نظر کر گریۂ شبنم نہ دیکھ
ذرہ ذرہ مہرِ رخشاں پتّا پتّا نخلِ طُور — دیکھنے والے تجلی کم نہیں ہے کم نہ دیکھ
جُنبشِ دامانِ قاتل دیکھ کر ہو جا شہید — تیغ میں دم خم نہیں ہے تیغ کا دم خم نہ دیکھ

تیری مہمانی کے قابل خانۂ اسعدؔ نہیں
صُبحِ محشر کی قسم اوسکی شبِ ماتم نہ دیکھ

حضرت اسعدؔ منشی صدیق حسن پیشکار ڈپٹی کلکٹر شاہجہانپور

۲۳

حُسنِ رُخِ جاناں کی اِک یاد دہانی ہے — واعظ کی زباں پر جو حوروں کی کہانی ہے
کیا زندگیٔ نَو کی تصویر ہے گلشن بھی — کلیوں میں لڑکپن ہے پھولوں میں جوانی ہے
تنظیم سے اجزاء کی تحریک ہے وابستہ — موجیں جسے کہتے ہیں قطروں کی روانی ہے
دونوں ہی کو کھینچا ہے ساحل کی تمنّا نے — چلتی ہوئی کشتی ہے، بہتا ہوا پانی ہے
ہمت کا تقاضہ ہے پہونچیں گے لبِ ساحل — بازو تو تھکے لیکن دریا میں روانی ہے

جب دل میں کسک نہ ہوگی تغزل نہیں ترتیب ہوگی
اعظم کے لئے لازم آشفتہ بیانی ہے

حضرت اعظم لکھنوی

(۲۴)

امیدوں سے دلِ برباد کو آباد کرتا ہوں
مٹانے کے لئے دنیا نئی ایجاد کرتا ہوں

تری میعادِ غم پوری ہوئی اے زندگی خوش ہو
قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے میں تجھے آزاد کرتا ہوں

میں اپنے دل کا مالک ہوں مرا دل ایک بستی ہے
کبھی آباد کرتا ہوں کبھی برباد کرتا ہوں

خودی کی ابتدا یہ تھی کہ اپنے آپ میں گم تھا
خودی کی انتہا یہ ہے خدا کو یاد کرتا ہوں

جفا کارو مری مظلوم خاموشی پہ ہنستے ہو
ٹھہر جاؤ ذرا دم لو ابھی فریاد کرتا ہوں

بتوں کے عشق میں کھویا گیا ہوں سن لے اختر
خدا شاہد ہے میں اکثر خدا کو یاد کرتا ہوں

پنڈت ہری چند اختر ایم۔ اے

(۲۵)

مرے خیال کی دنیا بسا رہا ہے کوئی
عجیب ترانۂ الفت سنا رہا ہے کوئی

شرابِ حسن کے ساغر پلا پلا کے مجھے
تمہارے عشق میں بیخود بنا رہا ہے کوئی

شباب و شعر کی رنگین وادیوں کی قسم
مجھے بہار کا نغمہ سنا رہا ہے کوئی

سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ہوائیں ہیں
فضا کو مستِ ترنم بنا رہا ہے کوئی

حضرت اعجاز اسلام آبادی

(۲۶)

جفائیں ادھر اور پیہم جفائیں — میرا ایک دل اور سو سو بلائیں
نہ جائیں وہ آئینہ خانہ نہ جائیں — انھیں لوٹ لیں خود نہ انکی ادائیں
تیری اک نگاہِ محبت پہ قرباں — میری آرزوئیں، مری التجائیں
دل و جاں تو کیا ہیں دو عالم لٹا دوں — وہ آئیں مرے سامنے بھی تو آئیں
انہیں بھی خرابِ محبت نہ کر دیں — شکستہ دلوں کی شکستہ صدائیں
سہارا دیا تیرا رحمت نے آخر — بہت کام آئیں ہماری خطائیں

مزہ جب ہے انور نگاہیں کسی کی
لٹیں اور پیامِ محبت سنائیں

(۲۷)

پھر انکی نگہ اٹھی سوئے دلِ دیوانہ — ٹکرا گئے آپس میں پھر شیشہ و پیمانہ
یہ قلبِ حزیں اپنا، یہ چشمِ سیہ انکی — اک عشق کا پیمانہ، اک حسن کا پیمانہ
میری ہی نگاہوں میں کونین کے جلوے ہیں — میری ہی جبیں تک ہے سنگِ درِ جانانہ
بیباک ادائیں ہیں، سفّاک نگاہیں ہیں — دنیا کی بلائیں ہیں اور اک دلِ دیوانہ
مسرور نگاہوں میں کانٹے بھی گلستاں ہیں — مایوس نگاہوں میں گلشن بھی ہے ویرانہ

بیتابیِ دل اپنی کام آہی گئی آخر
وہ غور سے سنتے ہیں انور ترا افسانہ

(۲۸)

نگاہوں سے دادِ وفا دینے والے — مٹا دے مجھے اور مٹا دینے والے

اِدھر بھی ذرا اِک نگاہِ محبّت — زمانے کو بیخود بنا دینے والے
مِری ہی جبیں تک ترا آستاں ہے — مجھے اپنے در سے اُٹھا دینے والے
ترا وصل جنّت، ترا ہجر دوزخ — جزا دینے والے سزا دینے والے
مُصیبت میں بھی دِل سکوں آشنا ہے — سلامت رہیں آسرا دینے والے
رہِ عشق کی منزلیں کر دے آساں — مِرا ہر قدم ڈگمگا دینے والے
غمِ عشق حد سے سوا چاہتا ہوں — مِرے حاجتوں سے سِوا دینے والے

تجھے اپنے انورؔ کی بھی کچھ خبر ہے
ارے ناز سے مُسکرا دینے والے

۲۹

میرا ہر اِک اشکِ غم۔ میری زبانِ راز ہے
سُننے والے سُن، محبت کی یہی آواز ہے

جذب ہوتا جا رہا ہوں آفتابِ حُسن میں
ذرّہ ہوں لیکن بلا کی قوّتِ پرواز ہے

اپنی ہر لغزش سے لیتا ہوں میں اِک تازہ سبق
میرا ہر انجام میرے واسطے آغاز ہے

ہو چکیں صرفِ دو عالم حُسن کی رنگینیاں
میری فِطرت کا مگر اب تک وہی انداز ہے

ایک عالم ہو رہا ہے فیضیابِ حُسن و عشق
اب مِری آواز بھی گویا تِری آواز ہے

چشمِ ظاہر میں تو انور، کچھ نہیں کچھ بھی نہیں
غور سے دیکھو تو ہر ذرّہ طلسمِ راز ہے

(۳۰)

پوچھو ذرا نگاہِ صیّاد و باغباں سے
گلشن کی زینتیں تھیں میرے ہی آشیاں سے

دِل ڈوبنے کا منظر شامِ فراق توبہ
ٹوٹے کوئی ستارہ جس طرح آسماں سے

اِتنی خطا پہ دُنیا بدنام کر رہی ہے
اِک پھول چُن لیا تھا دامانِ گلستاں سے

عالم کا ہر فسانہ ترتیب پا رہا ہے
کچھ اُنکی داستاں سی کچھ میری داستاں سے

منزل کی ابتدا ہی منزل کی انتہا ہے
اب بھی قدم وہیں ہیں اُٹھے تھے کل جہاں سے

اے جذبۂ محبّت تیرے کرم کے صدقے
میں بھی ہوں مطمئن سادہ بھی ہیں شادماں سے

احساس میں کمی تھی ادراک میں تھی خامی
وہ بھی وہیں تھے انورؔ گزرا ہوں میں جہاں سے

(۳۱)

ہر جنّتِ نگاہ کو شرما رہا ہوں میں
کِس بزمِ رنگ و بُو سے چلا آ رہا ہوں میں

رعنائیِ خیال پہ اِترا رہا ہوں میں
جس سمت دیکھتا ہوں اُنھیں پا رہا ہوں میں

شاید قریب منزلِ مقصود آ گئی
ہر ہر قدم پہ آج تھکا جا رہا ہوں میں

میرے جنونِ عشق کی سرمستیاں نہ پوچھ
جس سمت چل پڑا ہوں چلا جا رہا ہوں میں

ساقی کے چشمِ مست کے قربان جائیے
ایسی پلائی ہے کہ اُڑا جا رہا ہوں میں

حد سے گزر چکیں میری گستاخ جرأتیں
اُن کو بھی بات بات پہ تڑپا رہا ہوں میں

تم نے دِکھا کے جلوۂ رنگیں کی تابشیں
یہ کیا ستم کیا کہ چھپا جا رہا ہوں میں

انورؔ یہ اُن کے وعدۂ رنگیں کا ہے اثر
تصویرِ انتظار بنا جا رہا ہوں میں

حضرت انورؔ کانپوری

۳۲

جو حقیقتوں کی بہار تھی کبھی چشمِ اہلِ نیاز میں
ترے رازِ حسن کے پھول تھے جو کھلے ہیں آبِ مجاز میں

پسِ مرگ دادِ وفا ملی جو مُراد دستِ دُعا ملی
کہ تری وفا نے اُٹھا لئے مرے پھول دامنِ ناز میں

مری بیخودی نے غضب کیا کہ مٹا دی لذّتِ عاشقی
وہ جلن نہیں، وہ مزہ نہیں، مرے سوز میں ترے ساز میں

وہی عین ہے جو خیال ہے، یہ مری حقیقتِ حال ہے
جو شرابی ہوں دمِ میکشی تو نمازی ہوں میں نماز میں

نہ ہو اپنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی خم ہے زلفِ ایاز میں

جو بنا یہاں وہی مٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی بیدمؔ اِک نئی رسم ہے رہِ عشقِ شعبدہ باز میں

۳۳

کاش مری جبینِ شوق سجدوں سے سرفراز ہو
یار کی خاکِ آستاں تاجِ سرِ نیاز ہو

مجھکو بھی پائمال کر عمر تری دراز ہو
مستِ خرامِ ناز نہ درمشقِ خرامِ ناز ہو

چشمِ حقیقت آشنا دیکھیں جو حُسن کی کتاب
دفترِ صد حدیث راز ہر ورقِ مجاز ہو

سامنے رُخِ یار ہو سجدے میں ہو سرِ نیاز
یوں ہی حریمِ ناز میں آٹھوں پہر نماز ہو

اُس کے حریمِ ناز میں عقل و خرد کو دخل کیا ؟
جسکی گلی کی خاک کا ذرّہ جہانِ راز ہو

تیری گلی ہی پا کے جا ، جائے کہاں ترا گدا
کیوں نہ وہ بے نیاز ہو تجھ سے جسے نیاز ہو

بیدمؔ خستۂ ہجر میں بن گئی جانِ زار پہ
جس نے دیا ہے دردِ دل کاش وہ چارہ ساز ہو

حضرت بیدمؔ



دلِ کی زاہد نماز کیا جانے
غم پرستی کا راز کیا جانے

زخمِ بسمل کا ذوقِ بیتابی
شورشِ امتیاز کیا جانے

دل کا آئینہ توڑنے والا
حیٔ آئینہ ساز کیا جانے

کس لئے جھک گئی جبیں اپنی
سنگِ درگاہِ ناز کیا جانے

عشق کے دم سے لطفِ محفل ہے
حُسن خود بیں یہ راز کیا جانے

کیا گزرتی ہے خرمنِ دل پہ
شعلۂ برقِ ناز کیا جانے

بُت پرستی بھی حق پرستی ہے
کعبۂ امتیاز کیا جانے

کس کے کس کے جگر پہ تیر لگے
یار کی چشمِ ناز کیا جانے

حق پرستی کو سیری اے بہزاد
یہ طلسمِ مجاز کیا جانے

حضرت بہزاد فاطمی عظیم آبادی

۳۵

تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں
اب مجھے زندگی کی آس نہیں

کشمکش میں نہ روح پڑ جائے
یوں تو مرنے کا کچھ ہراس نہیں

راہ میں اپنی خاک ہونے دے
اور کچھ میری التماس نہیں

سانس لینے میں درد ہوتا ہے
اب ہوا زندگی کی راس نہیں

کیا بتاؤں مآلِ شوق جگر
آہ قائم مرے حواس نہیں

۳۶

جان ان پر نثار کرتا ہوں
مژدہ اے زندگی کہ مرتا ہوں

دل میں دیتا ہوں دعوتیں غم کو
اپنا پیمانہ آپ بھرتا ہوں

تیری رحمت سے نا امید نہیں
اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں

لا رہا ہوں انھیں تصور میں
اپنے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

کیا کہوں زندگی کا حال جگر
جبر سہتا ہوں ضبط کرتا ہوں

۳۷

جلوہ دل کھول کے دیکھا ہے خود آرائی کا
کیا کلیجہ ہے ترے حسن کے شیدائی کا

دعوئِ صبر پہ ظالم نے کیے اور ستم
حضرتِ دل یہ نتیجہ ہے شکیبائی کا

بات کرتا ہے اگر کوئی تو رو دیتا ہے
کچھ عجب حال ہوا ہے ترے سودائی کا

ہو گئی صرفِ جنوں طاقتِ رفتار بھی حیف
حق ادا ہو نہ سکا بادیہ پیمائی کا

آستانہ ہو کوئی دوست کا یا دُشمن کا
شوق ہے ہم کو جگرؔ ناصیہ فرسائی کا

(۳۸)

رُکے ہیں اشکِ خوں کس طرح بولیں
یہ انگارے تو پہلے سرد ہو لیں

نہ وہ ہم سے نہ اب ہم اُن سے بولیں
یہی بس دل میں ہے جی بھر کے رو لیں

یہ کون اُن نیم خواب آنکھوں سے پُوچھے
اجازت ہے کہ دَم بھر ہم بھی سو لیں

کسی کو دیکھ لیتے ہیں جو روتے
یہی جی چاہتا ہے ہم بھی رو لیں

جو ہوں آمادۂ سعیٔ رہائی
وہ پہلے زندگی سے ہاتھ دھو لیں

جو مُشتاقِ بہارِ زندگی ہیں
وہ اپنے خون میں دِل کو ڈبو لیں

یہ ساری آفتیں ڈھائی ہیں دل نے
جگرؔ ہم کیا لبِ فریاد کھولیں

(۳۹)

کیونکر کہوں زباں سے کہ تو مہرباں نہیں
لیکن مرا نصیب کہ میں شادماں نہیں

اُسکے ستم سے ہم کو غمِ دو جہاں نہیں
نا مہرباں سہی وہ اگر مہرباں نہیں

کوئی تو نازشِ صفِ ماتم بھی چاہیئے
میرا وجود تیرا ستم رائگاں نہیں

شرحِ غمِ حیات کا معلوم ہے صِلہ
خوش ہُوں کہ میرا حال کسی پر عیاں نہیں

تارے نہیں ہیں خاک کے ذرّے چمکتے ہیں
تیرا غبارِ راہ ہے یہ آسماں نہیں

صیاد کی نگاہ میں چنگاریاں ہیں کیوں
آئی نہیں بہار ابھی میں جواں نہیں

صدقے ہیں اپنی بے سر و سامانیوں کے ہم
شاخوں پہ بارِ خار و خسِ آشیاں نہیں

زہرابِ غم نے ہستیٔ دل کو مٹا دیا
اب ہم کو امتیازِ بہار و خزاں نہیں

کیفیتِ سرور ہے اور جلوۂ جمال
اب میں نہیں، زمیں نہیں، آسماں نہیں

سینے سے داغِ دل کو لگائے ہوئے ہیں ہم
کیا ہی؟ اگر یہ تیرے قدم کا نشاں نہیں

اُن پر ہے کسی کی برقِ تبسّم کی گرمیاں
بجلی کی لہر ہے مری روحِ رواں نہیں

رگ رگ میں جس کے نشترِ غم کا شگاف ہو
وہ کیا بتائے درد کہاں ہے کہاں نہیں

مصروفِ کارِ عشق خموشی سے ہیں جگر
ہم آشنائے شیوۂ آہ و فغاں نہیں

۴۰

دل جلوۂ جمال سے پنہاں لئے ہوئے
ذرّہ ہے آفتاب درخشاں لئے ہوئے

دل میں خیال جلوۂ جاناں لئے ہوئے
بیٹھا ہوں صد ہزار گلستاں لئے ہوئے

شب آ گئی سرور کا ساماں لئے ہوئے
ہاتھوں میں ساغرِ مۂ تاباں لئے ہوئے

ٹپکا جو چشمِ تر سے لہو آ گئی بہار
دامن میں لالہ و گل و ریحاں لئے ہوئے

یہ کون آ رہا ہے تری بزمِ ناز سے
آغوش میں عروسِ بہاراں لئے ہوئے

پھرتا ہوں اک نگاہِ کرم کی تلاش میں
روزِ ازل سے نذرِ دل و جاں لئے ہوئے

ہوں محو نغمہ ہائے حیات آفریں جگر
نظروں میں جلوۂ رخِ تاباں لئے ہوئے

۴۱

نازشِ گل ہوا کرے کوئی
دل سے کانٹا جدا کرے کوئی

ظلم کب تک سہا کرے کوئی
اب تو محشر بپا کرے کوئی

بہتے ہیں بات بات پر آنسو — ایسی آنکھوں کو کیا کرے کوئی
جب کسی بات میں اثر ہی نہیں — کیا دعا کیا دوا کرے کوئی
موت کو بھی نہیں قیام و دوام — نہ جیئے بھی تو کیا کرے کوئی
جب کلیجے میں تیر ہو پیوست — نہ کراہے تو کیا کرے کوئی
آستاں ہو اگر ترا معلوم — در بدر کیوں پھرا کرے کوئی
ضبط کی حد ہے موت تک لیکن — پھر ستم ہو تو کیا کرے کوئی
کچھ نہیں جس میں دردِ دل کا علاج — ایسی دُنیا کو کیا کرے کوئی

موت ہے امتحانِ شوق جگر
ورنہ کیوں کر وفا کرے کوئی

(۴۲)

ہر قطرۂ اشکِ خوں دریا نظر آتا ہے — ہر ذرّۂ خاکِ دل صحرا نظر آتا ہے
اُٹھتا مری آنکھوں سے پردہ نظر آتا ہے — اب رنگِ حقیقت کا کھلتا نظر آتا ہے
جب سے وہ سمایا ہے آنکھوں میں ہنسیا بنکر — جو کچھ نظر آتا ہے زیبا نظر آتا ہے
خوابِ غمِ اُلفت کی تعبیر ہوئی پوری — عالم میں جو ذرّہ ہے اپنا نظر آتا ہے
جب دل نہ شگفتہ ہو عشرت بھی مصیبت ہے — ہر پھول گلستاں کا کانٹا نظر آتا ہے
شاید کہ محبت کی اب تہ کو پہونچ جاؤں — جو زخم جگر میں تھا گہرا نظر آتا ہے

ہے موئے سپیدِ سر پیغامِ سفر گویا
ہوتا ہے جگر ترط کا تار نظر آتا ہے

۴۳

حقِ محبت کا اگر ہم سے ادا ہو جائے گا
سارا عالم مائلِ مہر و وفا ہو جائے گا

رفتہ رفتہ دِل اگر صبر آزما ہو جائے گا
درد کہتے ہیں جسے وہ خود دوا ہو جائے گا

جب جِلا ہو جائیگی دِل آئینہ ہو جائیگا
جس کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں خود نما ہو جائے گا

آستاں بھی کوئی ملجائے گا اے ذوقِ نیاز
سر سلامت ہے تو سجدہ بھی ادا ہو جائے گا

آہ جس دم ضبط ہو جائیگی بن جائیگی تیر
نالہ جب رُک جائیگا دِل میں رسا ہو جائے گا

رو ہی لینے دو ہمیں اِتنا بھی ظلم اچھا نہیں
دِل میں گر آنسو رُکا محشر بپا ہو جائیگا

تیری خودداری کے صدقے، بے نیازی کے نثار
اے دِلِ بے مُدّعا اب کیا خدا ہو جائے گا

گر یہی مشقِ تصوّر ہے یہی تصویرِ حُسن
دِل جسے کہتے ہیں اِک دن دلرُبا ہو جائے گا

سر اُٹھانے ہی سے آساں ہو گی منزل عشق کی
آبشارِ خونِ گردن رہنما ہو جائے گا

اے ہجومِ آرزو اے جذبۂ باطل پرست
بسکہ دِل بھی حقیقت سے جُدا ہو جائے گا

کُود پڑ دریا میں کیا طوفاں کا غم کشتی کی فکر
ہے اگر تجھکو یقیں فضلِ خدا ہو جائے گا

میری مٹی خاک ہو کر رہ نہیں سکتی جگر
ذرہ ذرہ آفتابِ پُر ضیا ہو جائے گا

۴۴

دِل ہے سینے میں تو غم سے عہد و پیماں کیجئے
موت کے ارمان سے جینے کا ساماں کیجئے

کُفر کو قربان یا ایماں کو قرباں کیجئے
ہو سکے تو دِل میں پیدا دردِ انساں کیجئے

داغ روشن کیجئے اے دل چراغاں کیجئے
شب کی تاریکی میں تابانی کا ساماں کیجئے

اِک جہاں ہو جائیگا پھر غمگسار و چارہ ساز
نشترِ غم پہلے پیوستِ رگِ جاں کیجئے

دیکھئے پھر جلوۂ رنگینیٔ حسن و جمال
دِل کے ارمانوں کو نذرِ سوزِ پنہاں کیجئے

ہو ہی جائیگا کوئی قدر آشنائے رنگ و بُو
خونِ دل سے پہلے پیدا تو گلستاں کیجئے

ڈوبتے جاتے ہیں تارے بھیگتی جاتی ہے رات
حضرتِ دل اب تو زخموں کو نمایاں کیجئے

بخشئے چشمِ خُماری سے کبھی کیف و سُرور
راہ و رسم و زندگی مُشکل ہے آساں کیجئے

خرمنِ جان و جگر ہے آرزو مندِ فروغ
بے محابا اِک نگاہِ برقِ ساماں کیجئے

کیف بنکر عرصۂ کونین پر چھا جائیے
دِل کو یوں محوِ خیالِ رُوئے جاناں کیجئے

کائناتِ زندگی ہم سونپتے ہیں آپ کو
اب اِسے ویرانہ کیجئے یا گلستاں کیجئے

حقِ محبت کا ادا کرنا جگرؔ آساں نہیں
دیکھئے دل میں شگاف اور لب کو خنداں کیجئے

(۴۵)

اپنے ہی سجدے کا ہے شوق میرے سرِ نیاز میں
کعبۂ دل ہے سامنے محو ہوں میں نماز میں

پینا ہے گر تو خاک ڈال دیدۂ امتیاز میں
جام و خم و سبو نہ دیکھ میکدۂ مجاز میں

کس کا فروغِ عکس ہے محو ہے کون ناز میں
کوندرہی ہیں بجلیاں آئینۂ مجاز میں

عشق ہے غایتِ حیات، عشق مآلِ مرگ ہے
دونوں جہاں کو بھول جا عشق کے سوز و ساز میں

حسن کے آستانے پر ناصیہ رکھ کے بھول جا
فکرِ قبول و ردّ نہ کر پیشکشِ نیاز میں

یاد کسی کی آگئی، کٹ گئی زندگی کی رات
ورنہ کہاں نمود، صبح ایسی شبِ دراز میں

دفن ہے دل جگہ جگہ، کعبہ ہے گام گام پر
سجدہ کہاں کہاں کرے کوئی حریمِ ناز میں

خون کے آنسوؤں سے ہے زینتِ حسنِ دلِ جگر
چاہیئے داغِ عشق بھی سینۂ پاکباز میں

(۲۶)

یہ بھی ہے تکملۂ جلوۂ پنہاں ہونا
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں ہونا

ختم اسی پر ہی بس انسان کا ہنگامۂ زیست
کبھی خنداں، کبھی گریاں، کبھی حیراں ہونا

ناخنِ عشق کی محتاج گرہ حسن کی ہے
چاکِ دامانِ گل سے ہے گلستاں ہونا

جمع کرتا ہوں پھر اجزائے پریشانِ حیات
یاد آیا ہے مجھے محوِ غمِ پنہاں ہونا

اہلِ محفل ہیں فقط شمع کے آ دینے تک
شعلے کا کسوتِ پروانے میں پنہاں ہونا

ایسے دل سے کوئی کس طرح نباہے یارب
جسکو بسنا ہی مبارک ہو نہ ویراں ہونا

صورتِ نغمہ و نکہت ہو کہ ہو صورتِ گل
شرحِ بے ربطیِ خاطر ہے پریشاں ہونا

حسن اگر جلوۂ صد رنگ پہ موقوف نہیں
کیوں ہے یہ عارض و چشم و لب و دنداں ہونا

ہے جگر دادطلب عشق کی مجبوری بھی
ہائے ناکردہ گناہوں پہ پشیماں ہونا

۴۷

رہینِ غم تو رہے رازِ غم سمجھ نہ سکے / مآلِ کشمکشِ زیست ہم سمجھ نہ سکے

اُسے حیات سی نعمت عطا نہ کرنا تھا / طربِ طرب کو جو اور غم کو غم سمجھ نہ سکے

جئے تمہارے لئے جان دی تمہارے لئے / ہمارے تم بھی ہوا افسوس ہم سمجھ نہ سکے

کبھی جنوں کا سہارا لیا، خرد کا کبھی / تمہاری کس میں رضا تھی یہ ہم سمجھ نہ سکے

نہ جینے میں ہمیں راحت ملی نہ مرنے میں / حیات و مرگ کو جز نوعِ غم سمجھ نہ سکے

جنوں جنوں تھا خرد بھی تھا ایک نوعِ جنوں / بہارِ لالہ و گُل کیا تھی ہم سمجھ نہ سکے

گداگری کا بھرم بے نیازیوں سے رہا / مرے سوال کو اہلِ کرم سمجھ نہ سکے

عطا ہوئی ہمیں ہستی بھی نیستی بھی جگر / مآلِ کار وجود و عدم سمجھ نہ سکے

کبھی خوشی میں تھا غم اور کبھی خوشی غم سے / تھے اِس قدر غم و شادی بہم سمجھ نہ سکے

ہمیں میں عشق، ہمیں میں تھا علم عرفاں بھی / وہاں دو چار ہوئے تم سے ہم سمجھ نہ سکے

گزارنے کو تو ہم نے گزار دی اک عمر / ہمیں بھی کچھ ہوا حاصل یہ ہم سمجھ نہ سکے

ظہورِ جلوہ بھی تھا اک حجابِ حُسن جگر
کچھ اور اُس کے سوا خود کو ہم سمجھ نہ سکے

۴۸

جو بجھ سکی نہ کسی سے وہ چاہ ہے تیری / اجل کی راہ سے دُشوار راہ ہے تیری

کہاں کا جنت و دوزخ، کہاں کا دیر و حرم / مجھے حیات سے مقصود راہ ہے تیری

ہزار لالہ و گُل کے پڑے رہے پردے / رہی جو دل میں اُتر کر نگاہ ہے تیری

نصیب سے مرے پہلو میں دِل نکل آیا / وگرنہ دور بہت بارگاہ ہے تیری

سِتم بھی اور جئے جانے کا تقاضا بھی
یہی تو ایک ادا بے پناہ ہے تیری

جہاں اجل کو بھی راحت کی نیند آتی ہے
وہ آستاں ہے تیرا، وہ پناہ ہے تیری

قبول کر مجھے جیسا بنا دیا تو نے
خطا معاف یہ ہستی گواہ ہے تیری

فریب اور کا میں کھا سکوں نہیں ممکن
جگر کی چوٹ ازل سے گواہ ہے تیری

اِسی پہ ترکِ محبّت کا زعم تھا اے دل
کہ اب تو اور بھی حالت تباہ ہے تیری

اسی میں غرق خودی اور بیخودی سب ہے
جگر کے دِل میں محبت اتھاہ ہے تیری

۴۹

کٹا دیتے محبّت میں قدم رکھنے سے سر پہلے
اگر انجام کی اپنے ہمیں ہوتی خبر پہلے

نہیں پیوست تھی رگ رگ میں نوکِ نیشتر پہلے
نہیں چبھتی تھی اِس انداز سے تیرِ نظر پہلے

محبّت کر کے اِک آزار کو ہم مول لے لیتے
پلا دیتی نہ گھونٹ امرت کے وہ آنکھیں اگر پہلے

نہ جانے زخمِ دل کو آج تم نے کس طرح چھیڑا
نہیں روتی تھی یوں آٹھ آٹھ آنسو چشمِ تر پہلے

وہ منزل ہے کہ اب ہر ہر قدم پہ دم اکھڑتا ہے
بہت آساں نظر آتی تھی تیری رہ گذر پہلے

جگر اب بھی نہیں خالی ہے دنیا باکمالوں سے
کوئی پیدا تو کر لے دیکھنے والی نظر پہلے

۵۰

کیفیت و سرور فزاواں کئے ہوئے
چھایا ہے دل پہ کون گلستاں کئے ہوئے

دشوارئ حیات کو آساں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں غم سے جبر کا پیماں کئے ہوئے

ہوتا ہے چاک چاک گریباں تو کیا کریں
کیوں آئے کوئی زلف پریشاں کئے ہوئے

پھر جان و دل کو ہے نگہِ ناز کی تلاش
مدّت ہوئی ہے برق کو احساں کئے ہوئے

آتا ہے کس کی چینِ جبیں کا خیال پھر
شیرازۂ حیات پریشاں کئے ہوئے

آرائشِ جمال میں مصروف ہے کوئی
پھرتا ہے کوئی چاک گریباں کئے ہوئے

محشر میں دیدنی ہے غمِ دل کی برکتیں
جیسے ہو کوئی سایۂ داماں کئے ہوئے

دل خون کر دیا جگرؔ آدابِ عشق نے
مدّت ہوئی تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

۵۱

کیا فائدہ رونے دھونے سے جب اس کا کچھ حاصل ہی نہیں
کیا درد سنائیں اپنا ہم سینے میں تمھارے دل ہی نہیں

جنگل سے گائیں گھر کو چلیں، چڑیاں بھی بسیرا لینے لگیں
میں کیسا مسافر ہوں یارب اُف میری کہیں منزل ہی نہیں

ہے آدھی رات کا سنّاٹا اور ساری دنیا سوتی ہے
کیا کہئے اپنی آنکھوں کو سونے پہ ذرا مائل ہی نہیں

آنکھوں کو رنگ نہیں بھاتے، کانوں کو راگ نہیں بھاتے
جیتے تھے جس کے سہارے ہم سینے میں اب وہ دل ہی نہیں

وہ درد ہمارا کیا جانے وہ حال ہمارا کیا سمجھے
ناسور نہیں جس کے دل میں، سینہ جس کا گھائل ہی نہیں

ہم کس سے درد کہیں اپنا اور کس سے پھر دکھڑا روئیں
کان اپنے بند کئے تو نے کوئی اور اس کے قابل ہی نہیں

دریائے محبت ہی میں ہوں کیفیت و مستی ہی دل میں
کچھ فکر نہیں ہے ساحل کی اس دریا کا ساحل ہی نہیں

(۵۲)

کیا دل کا حال کہیں تم سے جب دل ہی تم نے توڑ دیا
بیزار ہیں جینے رہنے سے ہم نے بھی اب جی چھوڑ دیا
تقدیر سے اپنا بس نہ چلا، کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑا
جس راہ پہ چاہا ڈال دیا جس سمت کو چاہا موڑ دیا
اُمید سے غم میں بھی گرمی تھی اب دل کی بستی سُونی ہے
آہیں وہ راہیں بھول گئیں، اشکوں نے اُمنڈنا چھوڑ دیا
اُمید جسے ہم سمجھے تھے وہ بھیک کا اِک کاسہ نکلا
پھر جب دیکھو تب خالی ہے سوائس کو ہم نے چھوڑ دیا

(۵۳)

آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ کیا کہہ گئے
ہم تو صورت دیکھ کر چپ رہ گئے
بندہ پرور، کیا کریں دل ہی تو ہے
چند قطرے آنسوؤں کے بہ گئے
دم وفا کا بھر سکے کس کی مجال
جن کو دعویٰ تھا وہ مر کر رہ گئے
ایک آنسو ہو مگر جانِ حیات
اِس سے کیا حاصل جو دریا بہ گئے
یوں تو رونا ہم کو آتا ہی نہیں
اور جب روئے تو دریا بہ گئے
الاماں طغیانیِ دریائے عشق
جو سفینے زد پہ آئے بہ گئے
لو قیامت کے مظالم توڑ لو
اور اگر ہم یہ بھی صدمے سہ گئے

اُٹھ گئے دُنیا سے معنی آشنا
اے جگرؔ صورت کے بندے رہ گئے

(۵۴)

اِندنوں دل ہے کچھ پریشاں سا — درد سینے میں ہے فراواں سا
کچھ ہے حسرت سی، کچھ ہے ارماں سا — دل کے چاروں طرف ہے زنداں سا
ہو چکا تار تار پیراہن — ابھی باقی ہے کچھ گریباں سا
زندگی تھی وہ یہ تو یاد نہیں — خواب دیکھا تھا اک پریشاں سا
زہر ہے گو غمِ محبّت زہر — کچھ تو ہے اس میں آبِ حیواں سا
خارِ وحشت ہے یا خدنگِ نظر — کچھ کھٹکتا ہے دل میں ارماں سا
یہ جہاں بھی جہان ہے کوئی — کچھ گلستاں سا کچھ بیاباں سا
بستے جاتے ہیں وہ نگاہوں میں — بھولتا جاتا ہے گلستاں سا
دل کے پردوں میں ہی جھلک اسکی — ہو رہا ہے کہیں چراغاں سا

تھک کے منزل پہ سو گیا ہے جگرؔ
مُنہ پہ ڈالے ہے کوئی داماں سا

بابو شیام موہن لال صاحب سکسینہ جگرؔ بریلوی

(۵۵)

اگر قدم نہ محبّت کا درمیاں ہوتا — تو یہ زمین ہی ہوتی نہ آسماں ہوتا
صُراحیوں کی ہر ایک بوند اشک بنجاتی — جوانیوں کا ہر اِک عشوہ رائگاں ہوتا
نہ یہ خرام نسیم بہار کو ملتا — نہ یہ نظام ستاروں کے درمیاں ہوتا

نہ عقل عشق و جوانی کے بھید پا سکتی ۔۔۔ نہ علم لالہ رُخوں کا مزاج داں ہوتا
خدائی قلب کا ہلکا سا وسوسہ ہوتی ۔۔۔ خدا ضمیر کا دُھندلا سا اِک گماں ہوتا
بلند و پست کی نبضیں چھُٹی چھُٹی رہتیں
حیات و موت کا چہرہ دُھواں دُھواں ہوتا

(۵۶)

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا ۔۔۔ رِندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا
کچھ روز تک تو نازش و فرزانگی رہی ۔۔۔ آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا
قرباں ترے کہ اِک نگہِ التفات نے ۔۔۔ دل کی جھجک کو جرأتِ رندانہ کر دیا
دُنیا نے ہر فسانہ حقیقت بنا دیا ۔۔۔ ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا
آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو جوشؔ نے
قربان اِک تبسمِ جانانہ کر دیا

حضرت جوشؔ ملیح آبادی

(۵۷)

جو دل کو کھو چکے ہیں وہ دِل کو ڈھونڈتے ہیں ۔۔۔ ہم دِل سے تنگ ہو کر قاتل کو ڈھونڈتے ہیں
کیا دُھن ہے جستجو کی یہ بھی خبر نہیں ہے ۔۔۔ دلبر کو ڈھونڈتے ہیں یا دِل کو ڈھونڈتے ہیں
راہِ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا ۔۔۔ منزل پہ ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں
جو زخم سے نے چکے ہیں جی لینے کو ہیں کافی ۔۔۔ اب کس لئے وہ اپنے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں
بے تیر و بے کماں کے جو دِل شکار کر لے
ہم تو جلیلؔ ایسے قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

۵۸

میں کسی اور سے کیوں شکوۂ بیداد کروں — لطف جب ہے کہ تجھی سے تری فریاد کروں
دل تو کہتا ہے غمِ عشق کا اظہار نہ ہو — دردِ دل کا یہ تقاضہ ہے کہ فریاد کروں
دو گھڑی چین سے رہنے کی یہی ہے صورت — تجھکو قاتل کے حوالے دلِ ناشاد کروں
تازہ کرتا ہے مرے زخم کہن کو صیاد — مجھسے کہتا ہے بہار آئے تو آزاد کروں
مست کر دے مجھے ساقی مگر اس شرط کے ساتھ — ہوش اتنا ہے باقی کہ تجھے یاد کروں

مجکو مدت ہوئی رہتے ہوئے گلشن میں جلیل
چل کے اب خانۂ صیاد کو آباد کروں

حضرت جلیل

۵۹

جوشِ غم میں گریۂ بے اختیار آہی گیا — ضبط کی حد سے گزر کر کچھ قرار آہی گیا
اُس نے کچھ دل سے کہا اور دل نے کچھ اُس سے کہا — اُس کو دل پر دل کو اُس پر اعتبار آہی گیا
غیر ممکن تھا کہ رہتا جذبِ اُلفت بے اثر — حسن کو بھی عشق پر آخر پیار آہی گیا
کیا جگر تھامے ہوئے بیٹھا ہے اُن کا بیقرار — اور اس انداز سے گویا قرار آہی گیا

پھر وہ ہائے رنگ و بو کی آڑ لے کر جنوں
وہ بہارِ جان و دل جانِ بہار آہی گیا

۶۰

تمہاری یاد دلوں کو ہلائے دیتی ہے — سکوتِ ساز کو نغمہ بنائے دیتی ہے
جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں چھپائے دیتی ہے — نظر دکھانے کو سب کچھ دکھائے دیتی ہے

زباں نے رازِ محبت کو راز رکھا تھا نگاہِ شوق فسانہ بنائے دیتی ہے
فریبِ چشمِ حقیقت نگر معاذ اللہ مری نگاہ سے مجکو چھپائے دیتی ہے

یہی ادائے محبت تو زندگی ہے جنوں
جو زندگی کو محبت بنائے دیتی ہے

مرزا نذیر حسین تمنا صدیقی جنوں

(۶۱)

جفا کوشی نہیں جاتی ستم رانی نہیں جاتی نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
نہیں جاتا کسی کی زلف کا سودا نہیں جاتا نہیں جاتی مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی
صنم خانے میں کعبہ میں طو گے بھی کہیں آخر زمانے بھر کی ہم سے خاک اب چھانی نہیں جاتی

پہلے تو کہا مجھ سے کہہ عشق کا افسانہ کھولی جو زباں بولے دیوانہ ہے دیوانہ
وہ آئے ہیں بالیں پر اے موت ذرا تھم جا یاد اُن کو دلا دوں میں بھولا ہوا افسانہ

میت پہ میری اب وہ تشریف جنا لائے
تکمیل کو پہونچا ہے اب زیست کا افسانہ

(۶۲)

خواہش نہیں دوا کی نہ مطلب شفا سے ہے میرا تو واسطہ ہی غمِ لا دوا سے ہے
مطلب مجھے بقا سے نہ مطلب فنا سے ہے مجھکو تو کام یار کی حمد و ثنا سے ہے
مطلب کسی غنی نہ کسی بے نوا سے ہے مطلب ہے گر تو یار کی جود و سخا سے ہے
مطلب مجھے سزا سے نہ مطلب جزا سے ہے مجھکو ازل سے کام خطا ہی خطا سے ہے

عاجزؔ حناؔ کو تاب و تواں سے غرض نہیں
اس کا گزر تو یار کی مہر و وفا سے ہے

۶۳

دُنیائے دل تباہ کئے جا رہا ہوں میں
دانستہ یہ گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اُلفت میں ہائے اس کا بھی احساس مٹ گیا
کیوں زندگی تباہ کئے جا رہا ہوں میں

کہتے ہیں کس کو عشق مجھے کچھ خبر نہیں
اُن کی طرف نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

دل ہی نے رہِ عشق میں دھوکے دیئے مجھے
دل ہی کو خضرِ راہ کئے جا رہا ہوں میں

انجام کا نہیں ہے ذرا ہوش اے حناؔ
فردِ عمل سیاہ کئے جا رہا ہوں میں

۶۴

سر میں سودائے محبت ہو مگر فرزانہ بن
دل ہو غم سے خون لیکن رنج سے بیگانہ بن

وہ جو پوچھیں بھی تو افشا کر نہ رازِ دردِ عشق
صاحبِ ذوقِ بلند و ہمتِ مردانہ بن

شوق رُسوا ہو کسی کے سامنے اچھا نہیں
ان کے آگے بھی حقیقت کو چھپا افسانہ بن

دیکھ حناؔ آنے نہ پائے تیری خودداری پہ حرف
باوجودِ عشق ہر ارمان سے بیگانہ بن

۶۵

وہ نازِ حسن دلِ ناتواں اُٹھا نہ سکا
نیازِ عشق کی تقدیر کو بنا نہ سکا

تیرے فراق میں کچھ ایسی سو گئی تقدیر
تمام عمر جگایا مگر جگا نہ سکا

جنونِ عشق بھی کیا شے ہے تجھکو او ظالم
ہزار بار بھلایا مگر بھلا نہ سکا

اُمڑ اُمڑ کے نہ رآئے اشک کے طوفاں　　　مرا نوشتۂ قسمت کوئی مٹا نہ سکا
وہ سجدہ بھی کوئی سجدہ ہے وائے ناکامی　　　جبیں کے داغِ ندامت کو جو مٹا نہ سکا

کچھ ایسا روٹھ کے اپنوں سے سو گیا تھا حنا
سوائے حشر کوئی پھر اسے جگا نہ سکا

(۶۶)

جلوۂ دل سے کام لے آہ کو پُر اثر بنا　　　منزل ابھی تو دور ہے شوق کو راہبر بنا
مانا کہ روئے یار پہ پردے پڑے ہیں صد ہزار　　　تو بھی نظر سے کام لے اپنی نظر نظر بنا
جلوۂ حسن راز ہے پردۂ راز ہی میں دیکھ　　　دل کو بنا قیام گاہ آنکھ کو رہگذر بنا
قبلہ ہے کس طرف مرا دوں میں کسی کو کیا پتہ　　　اُس نے جدھر کو رُخ کیا کعبہ مرا اُدھر بنا
حسن کی جلوہ ریزیاں خاص نہیں ہیں عام ہیں　　　دیدۂ دل سے کام لے آنکھ بنا نظر بنا

زینتِ عشق کے لئے سیکھ کمالِ زرگری
دیدۂ تر سے لے حنا مثلِ صدف گہر بنا

(۶۷)

کوئی تو ہجر میں تسکین کا ساماں ہو جائے　　　ورنہ ہی تڑپ کے دوائے غمِ ہجراں ہو جائے
کہیں بے پردہ اگر جلوۂ جاناں ہو جائے　　　سب حقیقت نگہِ شوق کی عریاں ہو جائے
دلِ ناکام یہی کھیل سہی فرقت میں　　　آج ہر قطرۂ خوں زینتِ مژگاں ہو جائے
عشق ہے حسن کا خالق تمھیں معلوم نہیں　　　میں جہاں چاہوں ہیں حسن نمایاں ہو جائے

ہوں حنا دامنِ ہستی کے جنوں میں پرزے
آج تو فیصلۂ دست و گریباں ہو جائے

۶۸

رسمِ اُلفت بڑھائے جاتے ہیں — وہ تصوّر میں آئے جاتے ہیں
اب کہیں یاد اُن کی جاتی ہے — اب کہیں وہ بھلائے جاتے ہیں
ہم کو بھی کاش یاد کرتے ہوں — جو ہمیں یاد آئے جاتے ہیں
کہہ گئی وہ نگاہِ مستانہ — یوں بھی ساغر پلائے جاتے ہیں

پھر چلا ہوں میں اُس طرف کو حناؔ
پھر قدم لڑکھڑائے جاتے ہیں

۶۹

خبر نہیں ہے کہاں ہوں میں اور کیا ہوں میں — پہنچ کے کونسی منزل میں کھو گیا ہوں میں
اُنھیں یہ ناز کہ پردہ میں کون دیکھے گا — مجھے یہ فخر کہ ہر شے میں دیکھتا ہوں میں
تڑپ تڑپ کے میسّر ہوا ہے خوابِ سکوں — اُٹھا تھا درد وہ دل میں کہ سو گیا ہوں میں
وہ شمع تھا نہ ہوا آشنائے بادِ سحر — طلوعِ صبح سے پہلے ہی بجھ گیا ہوں میں
وہ شکل ہوں جو نمایاں ہو اور بھی مٹ کر — وہ نقش ہوں جو بگڑ کر بھی بن گیا ہوں میں
تجھے سُنا نہیں سکتا میں درد کے نغمے — مجھے نہ چھیڑ کہ اک سازِ بے صدا ہوں میں

جو کھل سکے نہ کسی پر وہ راز ہوں میں حناؔ
جو آسکے نہ سمجھ میں وہ مدّعا ہوں میں

۷۰

یہ تو ممکن ہی نہیں فاش مِرا راز نہ ہو — کون سا ساز ہے جس میں کوئی آواز نہ ہو
شمع کی طرح لبِ ہے آنکھ سے آنسو جاری — نالۂ غم کا مزہ جب ہے کہ آواز نہ ہو

اُن سے جب لُطف کا انداز کوئی پاتا ہوں
جی دھڑکتا ہے کہ اس میں بھی کوئی راز نہ ہو

زندگی اپنی جو یوں گزرے تو پھر کیا کہنا
ہم ہوں اور تم ہو کوئی دوسرا ہمراز نہ ہو

نالۂ غم میں نہ ہو درد تو پھیکا رہنا
لُطف کیا سوز سے لبریز اگر ساز نہ ہو

(۷۱)

گزری ہے جن کی عمر محبت کئے بغیر
وہ بے نصیب مر گئے گویا جیئے بغیر

ہوتے نہیں ہیں ختم محبت کے مرحلے
بنتی نہیں ہے بات یہاں جاں دیئے بغیر

دامانِ زندگی پہ مرے بدتریں ہیں داغ
گزرے جو لمحہ نام تمہارا لئے بغیر

مجھکو اسی میں لُطف ہے اے اہلِ عقل و ہوش
رکھتا ہوں زخم ہائے جگر کو سیئے بغیر

ہیں اس کے زخم غیرتِ خُلدِ بریں حنا
بڑھ بڑھ کے زخم کھائے ہیں جو اُف کئے بغیر

(۷۲)

جتنی جفائے یار سے دل بستگی ہوئی
اتنی ہی کامیاب مری زندگی ہوئی

ایسا نہ ہو کہ اس کی محبت میں آئے فرق
دل کانپ اُٹھا جو درد میں پیدا کمی ہوئی

آنا نہ ادھر بھول کے بھی لے ہوائے یاس
دل میں ہے اک اُمید کی دُنیا بسی ہوئی

ہے اس کا حُسن جب سے حنا مرکزِ نگاہ
ہر شے ہے اعتبارِ نظر سے گری ہوئی

بھگوتی سنگھ صاحب سریواستو حنا لکھنوی

۷۳

اُسی کا جلوہ ہر جانب عیاں ہے
نمودِ حسنِ بے صورت کہاں ہے

ملی دل کی مرادیں نامرادی
ترے غم کی بدولت شادماں ہے

نکلنے پائے کیوں کر یاد اُن کی
درِ دل پہ محبّت پاسباں ہے

نہ چھوڑی تم نے حسرتؔ عشق بازی
تمنّا پیر ہو کر بھی جواں ہے

حسرتؔ موہانی صاحب

۷۴

اے بیخودیِ عشق مجھے یاد کئے جا
ہر قید سے ہر بند سے آزاد کئے جا

میں خوگرِ بیداد ہوں بیداد کئے جا
ہر روز نیا اِک ستم ایجاد کئے جا

میں داد کا طالب نہیں بیداد کئے جا
مطلب ہے فقط اتنا مجھے یاد کئے جا

بے کیف نہ ہو جائے کہیں رندِ بلانوش
مستانہ نگاہوں سے کچھ ارشاد کئے جا

ممکن ہے کہ مل جائے کبھی گوہرِ مقصود
تدبیرِ سکونِ دلِ ناشاد کئے جا

آئے گی بہار آئے گی ویرانۂ دل میں
تو ذکرِ چمن سے اِسے آباد کئے جا

یہ کیا ابھی خاموش ابھی مائلِ فریاد
فریاد ہی کرنی ہے تو فریاد کئے جا

یہ جوشِ قفس خود ہی کہیں سر نہ ہو جائے
اے جانِ چمن ماتمِ صیّاد کئے جا

ان کی یہی منشا ہے تو اے دردِ محبّت
ہر سانس کو آمادۂ فریاد کئے جا

بن جائے گا اِک روز یہی حاصلِ تمکین
تو دل کو رہِ عشق میں برباد کئے جا

جتنا ہی رہے حسنِ تعیّن کی حدوں میں
اُتنا ہی نگاہوں کو تو آزاد کئے جا

ہر حال میں راضی ہے خلیقِ جگر افگار
ناشاد کئے جا کہ اُسے شاد کئے جا

حضرت خلیق فیض آبادی

۷۵

دِل ہے برائے نام اب دِل میں شگفتگی نہیں
گل ہے مگر مہک نہیں، شمع ہے روشنی نہیں

عاشقی اور بقیدِ شوق کفر ہے عاشقی نہیں
اُسکی خوشی پہ جان دے تیری خوشی خوشی نہیں

موسم رنگ و کیف کی اب وہ ہما ہمی نہیں
سبزہ و ابر ہیں سب ہی ایک فقط وہی نہیں

سر ہے اختیار میں سجدہ وہ سجدہ ہی نہیں
بندگی اور بقیدِ ہوش کھیل ہے بندگی نہیں

جس میں برائے کیفیت رنج کی چاشنی نہیں
ایسی خوشی کا ذکر کیا ایسی خوشی خوشی نہیں

حسن کا دیکھ دِل نہ توڑ ضبط کو ضبط کر کے چھوڑ
زہر ملے تو منہ نہ موڑ عشق ہے یہ ہنسی نہیں

واعظِ سادہ لوح کی ہائے رے چیرہ دستیاں
مے کو بتا رہا ہے تلخ، ظلم یہ ہے کہ پی نہیں

اُس کی نظر ملی تو کیا اُس کی نظر پھری تو کیا
جس میں رہے یہ امتیاز عشق وہ عشق ہی نہیں

ناصحا دیکھ ناصحا اب تو بہت سنا چکا
دُور ہو میرے پاس سے تجھ پہ ابھی پڑی نہیں

جینے کو جی رہا ہوں میں تیرے بغیر بھی مگر
زندگی جس کو کہہ سکوں ایسی تو زندگی نہیں

کر گئی چشمِ مست کام ہو گیا نشۂ تمام
میکشو! اب مرا سلام فرصتِ میکشی نہیں

رو رو کے آہ تا بہ کے یوں ہی کوئی بسر کرے
میرے نصیب میں خمار جینے کی موت ہی نہیں

حضرت خُمار بارہ بنکوی

(۷۶)

ہوتا ہے وہی جو کچھ قسمت میں لکھا ہوتا
تدبیر اگر کرتا کچھ رنج سوا ہوتا

اللہ کی مرضی میں فریاد یہ کیا معنی
جب بس نہ تھا کچھ اپنا تو صبر کیا ہوتا

شرمندۂ درماں کیوں خالق نے کیا ہمکو
جس کی نہ دوا ہوتی وہ درد دیا ہوتا

اچھا ہے رواںؔ تم نے میخانہ سے مُنہ موڑا
آغاز تو جو کچھ تھا انجام بُرا ہوتا

(۷۷)

دل کو محوِ جلوۂ رُخسارِ جاناں کیجئے
بس یہی صورت ہے کافر کو مسلماں کیجئے

جو لکھا ہے کاتبِ تقدیر نے ہوگا وہی
اپنی کوشش بھی مگر تا حدِ امکاں کیجئے

آئیے حسرت کدۂ دل کے لیکن اس طرح
جو بجھی شمعیں ملیں اُن کو فروزاں کیجئے

جب فنا ہونا یقینی ہے دلِ بیمار کا
کیوں اُسے شرمندۂ تکلیف درماں کیجئے

دل کے داغوں کا جو منظر دیکھنا ہو صبحِ وصل
کچھ چراغوں کو بجھا کر پھر فروزاں کیجئے

چونک اُٹھیں گے قبر میں آسودگانِ خوابِ گ
یوں نہ سیرِ منزلِ گورِ غریباں کیجئے

(۷۸)

تقدیر جب معاونِ تدبیر ہو گئی
مٹی پہ کی نگاہ تو اکسیر ہو گئی

یا قتل کیجئے مجھے یا بخش دیجئے
اب ہو گئی حضور جو تقصیر ہو گئی

شبنم اُڑی گلوں سے مرا نقشہ کھنچ گیا
مُرجھا گئی کلی مری تصویر ہو گئی

بس تھم گیا سفیرِ عمل کہہ کے یا نصیب
جس جا پہ ختم منزلِ تدبیر ہو گئی

(۷۹)

یوں ہی گر ہر سانس میں تھوڑی کمی ہو جائیگی
ختم رفتہ رفتہ اک دن زندگی ہو جائیگی

دیکھنے والے فقط تصویرِ ظاہر پر نہ جا
ہر نفس کے ساتھ دنیا دوسری ہو جائیگی

گر یہی فصلِ جنوں زا ہے، یہی ابرِ بہار
عظمتِ توبہ نثارِ میکشی ہو جائے گی

مرگ بے ہنگام کہتے ہیں جسے آج اہلِ درد
کل یہی صورت بدل کر زندگی ہو جائیگی

ذکر ہے زنداں میں وہ گلزار پر بجلی گری
آج میرے آشیاں میں روشنی ہو جائیگی

شمع ساں جب شام ہی سے ہے گدازِ دل رواں
صبح تک کیا جانے کیا حالت تری ہو جائیگی

(۸۰)

وہ خوش ہو کے مجھ سے خفا ہو گیا — مجھے کیا امیدیں تھیں کیا ہو گیا
کسی غیر سے کیا توقع کہ جب — مرا دل ہی دشمن مرا ہو گیا
کہاں سے کہاں لائی قسمت مری — کس آفت میں میں مبتلا ہو گیا
میں یکجا ہی کرتا تھا اپنے حواس — کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا

رواںؔ تو کہاں اور کہاں دردِ عشق
تجھے کیا یہ مردِ خدا ہو گیا

جگت موہن لال صاحب رواںؔ اُناؔوی

(۸۱)

دل نہیں دل یہ ماجرا کیا ہے — محشر ایسا بپا ہوا کیا ہے
باتوں باتوں میں روٹھ جاتے ہیں — میرے اللہ انھیں ہوا کیا ہے
خیر نا راضگی سہی مجھ سے — یہ تو کہہ دو میری خطا کیا ہے
چھوڑ دو عہدِ گزشتہ کی باتیں — ایسی باتوں میں اب دھرا کیا ہے
دل لگی تھی جو سوزِ دل ہوا اب — ابتدا کیا تھی، انتہا کیا ہے
عشق نے حسن کی بنا ڈالی — گر عقیدت نہ ہو خدا کیا ہے

ایک احساس ہی تو ہے رہبرؔ
ورنہ اچھا ہے کیا بُرا کیا ہے

حضرت رہبرؔ بی۔ اے لاہور

(۸۲)

دُنیا و دیں کی حد سے بڑھا جا رہا ہوں میں
وہ دور ہٹ رہے ہیں اُنھیں پا رہا ہوں میں

اُن کے فریبِ حسن پہ اِترا رہا ہوں میں
دھوکا سمجھ رہا ہوں مگر کھا رہا ہوں میں

جیسے کہ اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں
یوں رشتۂ حیات کو اُلجھا رہا ہوں میں

وہ دیکھتے بھی ہیں تو کنکھیوں سے بار بار
آنکھیں بچا بچا کے پئے جا رہا ہوں میں

گیسو گزیدہ ہوں کسی گیسو دراز کا
زُلفوں کی طرح آج بھی لہرا رہا ہوں میں

آنکھوں میں اشک، اشک میں خونِ جگر لئے
کس کو بتاؤں آج کِدھر جا رہا ہوں میں

دُنیا کے رنج و غم ہیں مرے ہمدم و انیس
موجوں کے پیچ و خم میں بہا جا رہا ہوں میں

منزل بھی پیچھے رہ گئی منزل بہ منزل آج
یوں سعیِ جستجو میں بڑھا جا رہا ہوں میں

راحت رہینِ رقصِ حیات و ممات ہے
مدہوش کیفِ حسن ہوا جا رہا ہوں میں

حضرت چندر بھان پرشاد نگم راحت کانپوری

(۸۳)

عشق کی تکمیل کو اک معجزہ پاتا ہوں میں
دیکھتے ہیں جب وہ آئینہ نظر آتا ہوں میں

لذتِ دردِ محبت چاہتی رہتی ہے روح
یاد کرتا ہوں تمھیں اور دل کو تڑپاتا ہوں میں

کیا ہوئی وہ حسن کی تمکینِ بیجا کیا ہوئی
اب تو تم کو اپنی ہر ہر سانس میں پاتا ہوں میں

اِن تحیّر آفریں جلوؤں کی لائے تاب کون
دیکھ کر تجھ کو ترا آئینہ بن جاتا ہوں میں

(۸۴)

مغموم دل فسردہ طبیعت لئے ہوئے
پیدا ہوا ہوں دردِ محبت لئے ہوئے

پھر جا رہا ہوں آج سُوئے جلوہ گاہِ دوست
نظروں میں دو جہان کی وسعت لئے ہوئے

بیٹھا ہے دُور داورِ حشر اِک گناہ گار
آنکھوں میں اشک ہائے ندامت لئے ہوئے

تیری سکوں نواز تجلّی کا یہ اثر
ہر دل ہے اضطرابِ محبّت لئے ہوئے

سجدے کئے خدا کو مگر اے خیالِ یار
جھکو بمقتضائے طبیعت لئے ہوئے

سیرِ چمن سے زارؔ تغیّر نہ ہو سکا
پلٹا وہی فسردہ طبیعت لئے ہوئے

منشی محمود حسن صاحب زارؔ شاہجہانپور

۸۵

بیٹھا تو عجز نقشِ کفِ پا لئے ہوئے
اُٹھا تو دردِ دل کا سہارا لئے ہوئے

خواب و خیال عشرتِ دُنیا غلط ہوا
جانا پڑا مجھے غمِ دُنیا لئے ہوئے

نکلا ہوں بھیک مانگنے امن و سکون کی
شاید ہو کوئی قلبِ شکیبا لئے ہوئے

محشر میں ہی ضرورتِ وسعت بہ حدِّ شوق
میں آ رہا ہوں اِک نئی دُنیا لئے ہوئے

تھی کثرتِ جمال سے تاریکِ بزمِ دہر
آنا پڑا چراغِ تمنّا لئے ہوئے

دُنیا مجھے فریب، نویدِ حیات تم
جب لوگ جا رہے ہوں جنازہ لئے ہوئے

حضرت سیمابؔ اکبرآبادی

۸۶

اے نرگسِ ساقی مجھے مستانہ بنا دے
قیدِ غمِ کونین سے بیگانہ بنا دے

دُنیا کی حقیقت کا مجھے راز بتا کر
دُنیا کی حقیقت کو اِک افسانہ بنا دے

گر تو نے مجھے ذوقِ مئے ناب دیا ہے — عالم کو مرے واسطے میخانہ بنادے
شمع کو کبھی چہرۂ پُر نور دکھا کر — غمخوار جگر سوزئ پروانہ بنادے
صہبائے بہاراں کے پیاسے ہیں عنادل — ہر گل کو چھلکتا ہوا پیمانہ بنادے
دیوانگئ عشق میں برباد بنا کر — تو اپنے کرم سے مجھے فرزانہ بنادے
یہ قادرِ قدرت کی رضا ہے جب ہی چاہے — صحرا کو چمن، باغ کو ویرانہ بنادے
سنتا ہوں کہ بگڑی ہوئی قسمت نہیں بنتی — قسمت مری اے ہمتِ مردانہ بنادے

یہ ترکِ وفا کا ہے سرشؔ ایک کرشمہ
جو قطرہ سی شے کو دُرِ یکدانہ بنادے

حضرت دیس راج سرشؔ

۸۷

لُطفِ الم اُٹھائے جا عیش کی چاندنی نہ دیکھ
درد کا دل بڑھائے جا حُسن کی بے رُخی نہ دیکھ
غنچوں سے واسطہ نہ رکھ پھولوں کی دلکشی نہ دیکھ
رازِ شگفتگی سمجھ، حُسنِ شگفتگی نہ دیکھ
دیکھ لے آج حوصلہ ذوقِ نظّارہ ساز کا
بڑھ کے نقاب اُلٹ بھی دے حُسن کی برہمی نہ دیکھ
حُسنِ مجاز سے گزر دُور ہے منزلِ سکوں
تیز قدم اُٹھائے جا فرصتِ زندگی نہ دیکھ

عشق کو ملتمس نہ کر حسن کی بارگاہ میں
تُو تو خود آفتاب ہے ذرّے کی روشنی نہ دیکھ

ضبط کی ہمتیں بڑھا، شوق کی دارو گیر سے
چوٹ پہ چوٹ کھائے جا دل کی طرف کبھی نہ دیکھ

عزم کو مستقل بنا، جوشِ عمل سے کام لے
مقصدِ زندگی سمجھ، قیمتِ زندگی نہ دیکھ

حلقۂ جنوں سے بڑھ گئی وحشتِ دل تو کیا ہوا
ضبط کو ہاتھ سے نہ دے شوق کی سرکشی نہ دیکھ

درد کو بے نیاز کر خواہشِ التفات سے
مرتبۂ خودی سمجھ، حاصلِ بیخودی نہ دیکھ

حسن کو متہم نہ کر، شایقِ رنگ و بُو نہ ہو
چشمِ حقیقت آشنا جلوۂ ظاہری نہ دیکھ

کون سمجھ سکا سرورؔ عشق کی سربلندیاں
حسن کے گیت گائے جا، عشق کی برتری نہ دیکھ

(۸۸)

ہجومِ غم سے جو گھبرا کے آہ کی میں نے
جہانِ تازہ کی بُنیاد ڈالدی میں نے

نگاہِ شوق کی رنگینیاں نہیں جاتیں
نہ جانے کون سی تصویر دیکھ لی میں نے

مری وفا کی یہ تحقیر اے غرورِ جمال
خبر بھی ہے تری دُنیا سنوار دی میں نے

تصوّرات کی بے کیفیوں سے گھبرا کر
تعیّنات کی دُنیا اُجاڑ دی میں نے

مرے غرورِ محبت سے کھیلنے والے		ترے جمال کو بخشی ہے روشنی میں نے
پیامِ دردِ محبت تھی وہ نگاہ سرورؔ
سمجھ لیا تھا جسے حاصلِ خوشی میں نے

(۸۹)

لطفِ حیاتِ عشق لئے جا رہا ہوں میں		پیہم کسی کو یاد کئے جا رہا ہوں میں
جی جانتا ہے اسکے ستم کی لطافتیں		پھر بھی انھیں پہ ناز کئے جا رہا ہوں میں
اس چشمِ مے فروش نے مجبور کر دیا		"پینا نہیں قبول، پئے جا رہا ہوں میں"
معلوم ہے حقیقتِ عہدِ وفا مگر		دانستہ اعتبار کئے جا رہا ہوں میں
اللہ رے فراق کی مجبوریاں سرورؔ
دستِ دعا دراز کئے جا رہا ہوں میں

حضرت سرورؔ ڈھبائی

(۹۰)

ہائے وہ دردناک افسانے		جنکے ہیرو ہیں تیرے دیوانے
تم نہیں ہو تو دیکھتا ہوں میں		ہر طرف ہولناک ویرانے
چپ کھڑا ہوں ہجومِ محشر میں		منتظر ہوں کہ کوئی پہچانے
پا گئے جو شباب میں ترکیب		ہیں وہی بے پناہ افسانے
منہ لگوں کی خرابیاں توبہ		ٹھوکروں میں پڑے ہیں پیمانے
اب کہاں یورشِ پرستاراں		چند روزہ ہیں یہ صنم خانے
سسکیاں بھر رہی ہیں قندیلیں		کروٹیں لے رہے ہیں پروانے
ذرّہ ذرّہ امید کے در پر		سر جھکائے کھڑے ہیں دیوانے

شورشِ انقلاب زندہ باد
دم بخود ہیں بلند کاشانے
کیا عجب دل جلوں کی تربت پر
شمع لاکر جلائیں پروانے
تھک کے بیٹھے ہیں کوئے جاناں میں
تازہ دم ہورہے ہیں دیوانے
مل گیا عشق کا صلہ سرشار
ہوگئے بیکسی سے یارانے

۹۱

حجابِ ناز میں حسنِ بہار رہنے دے
ابھی نمائشِ نقش و نگار رہنے دے
کمالِ نازِ وفا کی بلندیوں پہ نہ جا
گرے ہوؤں ہی میں میرا شمار رہنے دے
تجلیات کی رَو میں پڑے ہوؤں کو نہ چھیڑ
قیامتوں سے انھیں ہمکنار رہنے دے
ابھر ابھر کے نہ کر نقشِ آرزو بیرنگ
مٹا مٹا کے اسے برقرار رہنے دے
حیاتِ نو کی یہی اک سبیل ہے سرشار
خزاں کی زد میں متاعِ بہار رہنے دے

حضرت سرشار کسنڈی

۹۲

کسی رنگ میں داستانی نہیں ہے
کوئی شے یہاں جاودانی نہیں ہے
ہے ٹھہراؤ بھی، صرف فانی نہیں ہے
حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے
خیالات کی حیرت انگیز دنیا
کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے
یہ ہے ہاں، یہ ہے ماجرائے حقیقت
نہیں ہے یہ افسانہ خوانی نہیں ہے
لہو ہے لہو سب یہ توبہ کا دل میں
سبو میں مئے ارغوانی نہیں ہے

عجب ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی — بڑی آگ ہے اُن میں پانی نہیں ہے
یہ کیا ہو گیا ہائے قلب و جگر کو — کہ آنکھوں کو وہ خوں فشانی نہیں ہے
ارے مجھ میں چھپ کے یہ کیا کہہ رہے ہو — مری بات میری زبانی نہیں ہے
بسی دل میں ہے ایک دُنیا کہ جس میں — کہیں کوئی رازِ نہانی نہیں ہے
نہ جینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا — خوشی تو ہے جب زندگانی نہیں ہے
روانی میں ہے عمر رُکتی ہوئی سی — مگر یہ تو کوئی روانی نہیں ہے
زمیں پر ہے پُورا اثر آسماں کا — محبت نہیں مہربانی نہیں ہے
خدائی میں جنسِ وفا کیوں گراں ہے؟ — خدائی میں جس کی گرانی نہیں ہے
سکت پائیے جس سے نہ پیری نہ طفلی — جوانی وہ کوئی جوانی نہیں ہے
خدا خود میں ہے آپ اپنی نشانی — غلط ہے کہ اس کی نشانی نہیں ہے
بھرے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے — یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحر ہے مشق کم کم
غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

۹۳

رہینِ جلوۂ تغیرِ امتیاز ہوں میں — کبھی ہوں ناز سراپا کبھی نیاز ہوں میں
عیاں ہے مجھ پہ تعلق سے کل نظام کا حال — جو ایک راز ہے دنیا تو ایک راز ہوں میں
مُراد بندگیِ حق ہے، یہ نہیں معلوم — کہ بُت پرست ہوں یا بندۂ نماز ہوں میں
کسی میں بھی تو نہیں کوئی اپنی اصلیت — نشیب کی ہے خبر، واقفِ فراز ہوں میں
فراق میں ہے عجب وصل کا لطیف احساس — ترا سپاس گزار اے شبِ دراز ہوں میں

نجانے ہو کہ نہو عشق میں حصولِ کمال
ابھی تو وقفِ ادا ہائے سوز و ساز ہوں میں

ہے یہ بھی کوئی کرشمہ مری حقیقت کا
فریب خوردۂ نیرنگئ مجاز ہوں میں

مرے وجود سے ہے کائنات کی تکمیل
جو کچھ ہوں سحر اخود اپنا مگر جواز ہوں میں

حضرت سحر ہنگامی

۹۴

احساس کچھ نہ تھا کہ کدھر دیکھتے رہے
آنکھیں بچائے اُن کی نظر دیکھتے رہے

آنکھوں میں کٹ گئی شبِ فرقت نہ پوچھیے
تارے فلک کے تا بہ سحر دیکھتے رہے

چھٹکر قفس سے پھر نہ ملا آشیاں کہیں
ہم ہر چمن میں شاخ و شجر دیکھتے رہے

وہ شوق دید اور وہ بیباکیاں، وہ حُسن
ہلکا سا تھا حجاب مگر دیکھتے رہے

دھوکا دیا نگاہِ تصوّر نے ہم کو شوق
اِک عکسِ ضو فگن تھا جدھر دیکھتے رہے

۹۵

جھلک تھی جلوے کی لیکن وہ بے حجاب نہ تھا
نگاہِ شوق کا در پردہ کچھ جواب نہ تھا

خودی کے نشہ میں دل مائلِ شراب نہ تھا
وہ ایک پردۂ غفلت تھا مست خواب نہ تھا

بہار آئی، کھلے پھول، ہر فضا بدلی
مگر یہ دل ہی تھا جس میں کہ انقلاب نہ تھا

نسیم صبح نے غنچوں سے چھیڑ چھاڑ جو کی
چمن میں عارضِ گُل کوئی بانقاب نہ تھا

ہوا نہ ہم کو کچھ احساس جوشِ بے تابی
فریبِ شورشِ دل تھا یہ اضطراب نہ تھا

ہجومِ موجِ فنا سے مُحال تھا بچنا
کسی کے ہاتھ میں وہ ساغرِ حباب نہ تھا

ہزار آفتیں گو دل کے ساتھ تھیں لیکن — غریق موجۂ بدمستیِ شباب نہ تھا
کبھی وہ کعبہ بنا اور کبھی وہ بتخانہ — یہ اور کیا تھا اگر دل کا انقلاب نہ تھا

صلائے عام تو ساقی کی تھی مگر اے شوق
ہمارے میکدے میں شیشۂ شراب نہ تھا

پنڈت جگموہن ناتھ صاحب رینہ شوق ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر

(۹۶)

ہستی کو فنا کر دے ہستی میں فنا ہو جا — ہوتا ہے تو اس سے بھی کچھ اور سوا ہو جا
کچھ قدر نہ کی اس نے گر تیری وفاؤں کی — تو اُسکی جفاؤں پر خوش ہو کے فدا ہو جا
اے مرگ خبر کر دے سب قافلہ والوں کو — اے شورِ صفِ ماتم آہنگ درا ہو جا
احساس غم و راحت ہستی نے مٹا ڈالا — بن زخم جگر مرہم اے درد دوا ہو جا

اُٹھتے ہیں وہ محفل سے اے فتنۂ رَوَاں اُٹھ
آتے ہیں وہ مقتل میں قدموں پہ فدا ہو جا

حضرت شاد

(۹۷)

تو سہی جذبۂ دل کھینچ بلائیں گے انھیں — عمرِ رفتہ تو نہیں ہیں کہ بلا ہی نہ سکیں
زخمِ شمشیرِ محبت ہمیں دل سے منظور — داغِ فرقت وہ دے یارب کہ اُٹھا ہی نہ سکیں
نقشِ ہستی کو حسینوں نے کیا میری فنا — اب ہوں نقشِ تصور کہ مٹا ہی نہ سکیں
لاکھ پردوں میں چھپیں ڈھونڈھ نکالیں گے انھیں — بت خدا ہے جو کسی کو نظر آ ہی نہ سکیں
اب کی وہ نیند تجھے آ کے سلا دے اے موت — چاہیں احباب جگانا تو جگا ہی نہ سکیں

نقشِ پا بن کے جموں کوئے بتاں میں شیدا
جا کے اس شکل سے بیٹھوں کہ اُٹھا ہی نہ سکیں

حضرت شیدا

(۹۸)

عشق کی سادگی کو دیکھ حُسن کی برہمی نہ دیکھ
یعنی جو ہے نظارہ سوز اُس کی طرف کبھی نہ دیکھ

دیر و حرم میں رہ کے بھی، توڑ دے اُنکی بندشیں
رنگِ مجاز پر نہ جا صورتِ ظاہری نہ دیکھ

وقت پڑے تو فرض ہے عشق کی منزلت کا پاس
حُسن کی بارگاہ میں حُسن کو مُڑ کے بھی نہ دیکھ

حد سے گزر نہ جاؤں گا، میں کوئی مر نہ جاؤں گا
تیری جو ہے یہی رضا میری طرف کبھی نہ دیکھ

لذّتِ دردِ ہجر ہے لذّتِ وصل سے سوا
عشق کا مدعا تو دیکھ عشق کی بیکلی نہ دیکھ

مرکزِ حُسن سے کہیں پائے خیال ہٹ نہ جائے
اپنی خودی پہ رکھ نظر عشق کی بیخودی نہ دیکھ

اور بھی ذرا حوصلہ دے کلیم کو
جوہرِ عاشقی تو دیکھ منظرِ بیہشی نہ دیکھ

کچھ کہیں رنگ لے نہ آئے جذبۂ شوقِ ناتمام
جو ترا صبر آزمائے اُس کی طرف کبھی نہ دیکھ

بارشِ اشک غم نہیں ، ریزشِ نورِ حُسن ہے
چاندنی کا نظارہ کر چادرِ شبنمی نہ دیکھ

میری خوشی اسی میں ہے میں نہ کبھی ہوں شادکام
ظرف کا امتحاں نہ لے تو مری تشنگی نہ دیکھ

کام تمام کر سکے ایک ہی جنبشِ نظر
شائقِ نیم جاں کی سمت بارِ دگر کبھی نہ دیکھ

(۹۹)

ان آنکھوں سے ساغر لئے جا رہا ہوں — پئے جا رہا ہوں پئے جا رہا ہوں
وفاؤں کے تحفے دئے جا رہا ہوں — گُناہِ محبت کئے جا رہا ہوں
وہ نظروں سے چرکے دیئے جا رہے ہیں — میں تارِ نظر سے سیئے جا رہا ہوں
کبھی تو مری یاد آئے گی تجھ کو — تری یاد ہر دم کئے جا رہا ہوں
محبت میں جینا قیامت ہے لیکن — ترے آسرے میں جئے جا رہا ہوں
وہ داغِ محبت دئے جا رہے ہیں — میں دل کو گلستاں کئے جا رہا ہوں
نمازِ محبت ادا ہو رہی ہے — ترے در پہ سجدے کئے جا رہا ہوں
میں جاتا تو ہوں بزم سے تیری لیکن — تصور کو تیرے لئے جا رہا ہوں

میں ان کی ہی محفل میں خود اُن سے شائقؔ
نگاہوں سے باتیں کئے جا رہا ہوں

حضرت کیلاش ورما شائق بی اے ہنگامی

۱۰۰

گیت تیرے حسن کے گاتا ہوں میں
چاند کی کرنوں کو تڑپاتا ہوں میں

یہ مقامِ عشق ہے بالائے فہم
تجھکو پاکر آپ کھو جاتا ہوں میں

منزلِ مقصود ہوتی ہے قریب
راستے سے جب بھٹک جاتا ہوں میں

ہے اسی کا نام سعیٔ زندگی
دل کو اُمیدوں سے بہلاتا ہوں میں

داستانِ دل ہے کہنے کے لئے
داستانِ دل کہے جاتا ہوں میں

بیکسی بھی تو خدا کی دین ہے
بیکسی پر اپنی اِتراتا ہوں میں

میرے استقبال کو مستی بڑھے
میکدے میں جھوم کر آتا ہوں میں

اُسکے دل میں بھی ہے داغِ سوزِ عشق
چاند کو ہم داستاں پاتا ہوں میں

چھیڑتی ہے صبح جب سازِ حیات
وجد میں آتا ہوں اور گاتا ہوں میں

خود تڑپتا ہوں تڑپ کر اے ضیاؔ
اہلِ محفل کو بھی تڑپاتا ہوں میں

حضرت ضیاؔ فتح آبادی

۱۰۱

نشاں اس کا کسی سے کیا بیاں ہو
وہی پائے نشاں جو بے نشاں ہو

مُبرّا وہ تو ہے کون و مکاں سے
مکاں اس کا کہاں جو لامکاں ہو

جگہ کوئی نہیں ہے اُس سے خالی
زمیں ہو عرش ہو یا آسماں ہو

سوا اُسکے نہیں کوئی جہاں میں
تلاش اس کی کرو یارو جہاں ہو

ٹھکانا اُس کا میں کیونکر بتاؤں
خدا جانے وہ ہرجائی کہاں ہو

طراّب استاد سے معلوم کر لو
طریقِ معرفت گر قدر داں ہو

حضرت طرّاب

۱۰۲

رنجش کے لطف دیکھتے ہیں کس ادا سے ہم
بیٹھا ہے یار ہم سے خفا اور خفا سے ہم

زُلفوں میں یاں بل ہے دِل میں تصوّر ہے زلف کا
لپٹی ہوئی ہے ہم سے بلا اور بلا سے ہم

حُسن اثر سے ضد اُسے یاں خواہشِ ہزار
بگڑی ہوئی ہے ہم سے دعا اور دعا سے ہم

یاں ہاتھ مل رہے ہیں وہاں ہے وہ پائمال
کھاتی ہے رشک ہم سے حنا اور حنا سے ہم

بدلی گھر آئی رنگ پہ ہے شغلِ مےکشی
اُڑتی ہے آج ہم سے ہوا اور ہوا سے ہم

تکرار بوسۂ لبِ شیریں پہ شامِ وصل
رنجیدہ ہے وہ ہم سے ذرا اور ذرا سے ہم

حضرت عاشق

۱۰۳

مناظرِ غم گزر رہے ہیں، حجاب عالم اُٹھا رہا ہوں
سکوت ہے شامِ بیکسی کا کھڑا ہوں اور مُسکرا رہا ہوں

اُمید غم سے بدل چکی ہے نصیب پر مُسکرا رہا ہوں
سنا چکا ہوں اُنھیں فسانہ اب اپنے دل کو سنا رہا ہوں

چمن میں غنچے چٹک رہے ہیں فضا سے نغمے برس رہے ہیں
ربابِ ہستی کا ساز بن کر تمام عالم پہ چھا رہا ہوں

مری مسرت کا پوچھنا کیا مِلی ہے خوشبوئے زلفِ جاناں
چلا ہوں موجِ نسیم بن کر فضا کو بیخود بنا رہا ہوں
نشاط و صبر و قرار کیسا، بہا رِ دیدارِ یار کب تک
خود اپنے جلوؤں میں کھو رہا ہوں خود اپنی نظروں پہ چھا رہا ہوں
کرشمہ سازیٔ چشم برہم، قرار دِل کو نہیں کوئی دم
میں جس قدر دور ہٹ رہا ہوں اُسی قدر پاس آ رہا ہوں
فروغِ حرماں کی لذّتوں پر عیاںؔ تصدّق وصالِ جاناں
نگاہ جلوہ بنی ہوئی ہے میں اُن کو ہر لحظہ پا رہا ہوں

حضرت عیاںؔ کانپوری



مجھکو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا
دولتِ دو جہاں نہ دی اِک دلِ مبتلا دیا

دِل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا

قبر میں جب کسی طرح دِل کی تڑپ نہ کم ہوئی
یادِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا

روزِ جزا گلہ تو کیا، شکرِ ستم ہی بن پڑا
ہائے کہ دل کے درد نے درد کو دِل بنا دیا

اب مری لاش پہ حضور موت کو کوستے تو ہیں
آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

اُف کہ گناہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف
اُٹھ اُٹھ کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

آپ ہی اپنی آگ میں اے غمِ عشق جل بجھے
آگ لگے اُس آگ کو پھونک دیا جلا دیا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دِل نے مجھے سُلا دیا

گریۂ آتشیں کی داد دے شبِ غم تو کون دے
خود سرِ شام کیا بجھی شمع نے دِل بجھا دیا

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیؔ نا امید کو موت کا آسرا دیا

۱۰۵

اُس نورِ مجسّم کے افسانے کو کیا کہیے
ہے شمع بھی پروانہ پروانے کو کیا کہیے

کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانے کا جل بجھنا
جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہیے

آغاز بھی تو جس کا، انجام بھی تو جس کا
اُس دردِ محبت کے افسانے کو کیا کہیے

آبادی کی آبادی ویرانے کا ویرانہ
ارمان بھرے دل کے کاشانے کو کیا کہیے

اُجڑی ہوئی آنکھوں میں رونق تمہی سے دم تھی
ویران ہے ہر بستی ویرانے کو کیا کہیے

کس نے اُسے دیکھا ہے اے حسرتِ نظّارہ
فانیؔ تو ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیے

حضرت فانیؔ بدایونی

۱۰۶

اب مری پیاس کو درکار ہے جلتی ہوئی آگ
ساقیا لوٹ دے ساغر میں پگھلتی ہوئی آگ

سوزِ اُلفت ہے مرے دل سے نکلتی ہوئی آگ
یہ مئے تُند ہے ساغر سے اُبلتی ہوئی آگ

پردۂ تاک میں پوشیدہ ہے جلتی ہوئی آگ
مئے انگور ہے ساغر میں کہ گلتی ہوئی آگ

تیرے شیشے سے بصد ناز و ادا اے ساقی
خود مری سمت لپکتی ہے مچلتی ہوئی آگ

ایک عالم نے شفق جس کو سمجھ رکھا ہے
ہے مرے خونِ تمنّا کی اُچھلتی ہوئی آگ

شر انگیز و شرر خیز و شرر در آغوش
بادۂ ناب ہے یا سانچہ میں ڈھلتی ہوئی آگ

اس میں اک تلخیٔ شیریں ہے کہ شیرینیٔ تلخ
بادہ ہے چشمۂ حیواں سے نکلتی ہوئی آگ

اس کی گرمی کا ہے احساس مری رگ رگ میں
خونِ دل ہے کہ مرے جسم میں جلتی ہوئی آگ

الاماں سوزِ دروں! الحذر اے جوشِ جنوں!
نکلی جاتی ہے مرے دل کو مسلتی ہوئی آگ

دل دھڑکتا ہے مرے سینے میں یا اے فرحت
میرے پہلو میں تڑپتی ہے مچلتی ہوئی آگ

حضرت گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری

(۱۰۷)

تھرتھری سی ہے آسمانوں میں
کچھ تو ہے زور ناتوانوں میں

انھیں تنکوں میں ڈھونڈھ اے بلبل
بجلیاں بھی ہیں آشیانوں میں

منزلیں دور سے چمکتی تھیں
کھو گئیں آ کے کاروانوں میں

کوئی سوچے تو فرق کتنا ہے
حسن اور عشق کے فسانوں میں

رات دن اک دیا سا جلتا ہے
اہلِ غم کے سیاہ خانوں میں

ایک چرکا سا وقت کا کھا کر
بانکپن آ گیا جوانوں میں

موت کے بھی اڑے ہیں اکثر ہوش
زندگی کے شراب خانوں میں

کام لے خونِ آرزو سے فراق
رنگ بھر غم کی داستانوں میں

(۱۰۸)

خود کو کھویا بھی کہاں عشق کو پایا بھی کہاں
ختم ہو دیکھئے تیرا سر و سودا بھی کہاں

رنج و راحت سے بہت دور ہے اب حالتِ عشق
آج پہونچی ہے تری رنجشِ بیجا بھی کہاں

جو رِ پیہم سے ترے چھوٹ رہے ہیں لیکن
آج ہم اہلِ وفا پائیں گے ایسا بھی کہاں

نام بدنام ہوا الفت میں بدنامی کا
ہوسکا کوئی ترے عشق میں رُسوا بھی کہاں

اہلِ دل جس کو تری برقِ نظر کہتے ہیں
ہاں وہ اندازِ فنا عشق کو آیا بھی کہاں

ضبط کی تاب نہ تھی پھرتے ہی مَست نگاہ
آج پیمانۂ دِل ہاتھ سے چھوٹا بھی کہاں

اس کا اندازِ تغافل وہ نہیں اب لیکن
عشق کی آنکھوں سے اُٹھتا ہے یہ پردا بھی کہاں

ایک ہی کام ہوا یعنی ترا نظّارہ
نگہِ شوق نے لیکن تجھے دیکھا بھی کہاں

یہ بھی سچ ہے کہ تغافل ترا ایسا بھی نہیں
یہ بھی سچ ہے کہ محبت کا زمانہ بھی کہاں

آج ساقی کی نظر اک نئی دُنیا سے لڑی
میکشو، ساغرِ سرشار یہ چھلکا بھی کہاں

میں یہ کہتا ہوں کہ افلاک سے آگے ہوں بہت
عشق کہتا ہے ابھی دردِ دل اُٹھّا بھی کہاں

اہلِ دل حسن پہ الزامِ ستم کیا دھرتے
اُسکا پیمانِ وفا یاد اُنھیں آتا بھی کہاں

جیسے کچھ چونک پڑیں سوئی ہوئی تقدیریں
آج ہوتا ہے اِن آنکھوں کا اشارا بھی کہاں

فیصلہ عشق کی تقدیر کا ہوتا معلوم
آپ نے کچھ مگر اس باب میں سوچا بھی کہاں

ہم نے مانا کہ غمِ ہجر بھی دھوکہ ہے فراق
اور اگر غور کریں دل میں تو دھوکہ بھی کہاں

رگھپتی سہائے صاحب فراقؔ گورکھپوری

(۱۰۹)

مسندِ دل اُن کی برقِ نظر پا رہا ہوں میں
ذرّہ سے آفتاب بنا جا رہا ہوں میں

راہِ طلب میں اُس کی مٹا جا رہا ہوں میں
مرنے میں زندگی کا مزا پا رہا ہوں میں

اب اُنکو مہربان سا کچھ پا رہا ہوں میں
اب اور سے کچھ اور بنا جا رہا ہوں میں

اُنکو جو بے نقاب نہیں پا رہا ہوں میں
ساحل کے پاس غرق ہوا جا رہا ہوں میں

تاثیر آبِ تلخ میں یہ پا رہا ہوں میں
بے بال و پر ہوں اور اُڑا جا رہا ہوں میں

بے التفات مجھ سے ہوئے جاتے ہیں وہ
اس پر بھی عرضِ حال کئے جا رہا ہوں میں

اب ہو چلی ہے اُسکی بھی رحمت کرم نواز
کچھ اس طرح گناہوں پہ شرما رہا ہوں میں

اب ہوتا جا رہا ہے تحمّل جمال کا
اب رفتہ رفتہ ہوش میں کچھ آ رہا ہوں میں

تاثیر آبِ تلخ کا اللہ رے کمال
جیسے کہ پر لگا کے اُڑا جا رہا ہوں میں

یہ اضطرابِ شوق میں طاری ہے بیخودی
منزل سے اور آگے بڑھا جا رہا ہوں میں

لازم ہے پاس خاطرِ اربابِ میکدہ
پینی نہیں ہے اور پئے جا رہا ہوں میں

منزل دراز اور کوئی راہبر نہیں
اس پر بھی گرتا پڑتا چلا جا رہا ہوں میں

اس عمر حیلہ ساز کی حاجت نہیں مجھے
جو خود تو بڑھ رہی ہے گھٹا جا رہا ہوں میں

تیری نظر سے گر کے کچھ ایسا گرا وقار
اپنی بھی اب نظر سے گرا جا رہا ہوں میں

فارقؔ کسی سے شکوۂ بیداد کیا کروں
اپنے کئے کی آپ سزا پا رہا ہوں میں

۱۱۰

کیفِ بہارِ عارضِ جاناں لئے ہوئے
اُٹھتی ہے ہر نگاہ گلستاں لئے ہوئے

محدود تو نہیں تری افزونئِ کرم
مانا کہ میں ہوں کثرتِ عصیاں لئے ہوئے

ہر ذرہ کوہِ طور کا مستِ جمال ہے
کیفِ تجلّیٔ رُخِ جاناں لئے ہوئے

دیکھوں مجھے اُڑائے پھریگی کہاں کہاں
اُس کی ہوائے جنبشِ داماں لئے ہوئے

کتنا خجل ہوں دیکھ کے افزونئِ کرم
اِترا رہا تھا وسعتِ داماں لئے ہوئے

(۱۱۱)

دل نہ دیکھا اور سب کون و مکاں دیکھا کئے
وہ کہاں ذوق فزا تھے، ہم کہاں دیکھا کئے

آج یہ بھی انقلابِ آسماں دیکھا کئے
برق کی آغوش میں ہم آشیاں دیکھا کئے

یاں گلستاں میں قفس کے خواب آتے تھے نظر
یا قفس میں روز خوابِ گلستاں دیکھا کئے

یاد ہے اک دلربا نظارہ بھی تھوڑی دور کا
کارواں والے ہیں، ہم کارواں دیکھا کئے

بے حجابی پہ بھی اُنکی اک حجابِ خاص تھا
کچھ نہ کچھ ہم اپنے اُنکے درمیاں دیکھا کئے

فاتحہ کو ہاتھ اُٹھائے، اشک آنکھوں میں بھرے
وہ مزارِ فارقؔ، خلد آشیاں دیکھا کئے

(۱۱۲)

بس یہی سوزِ غمِ عشق کا حاصل نکلا
دل کی تصویر پہ ہر اک آبلۂ دل نکلا

روکتا کیا مجھے گردابِ بلائے دُنیا
ایک ہی موج میں جا کر لبِ ساحل نکلا

ڈوبنا ہی تھا مرا میرے لئے وجہِ نجات
کیسا ساحل مرے آغوش میں ساحل نکلا

میں یہ سمجھا کہ مرے اشکِ محبت نکلے
وہ یہ سمجھے مرے قابو سے مرا دل نکلا

اُڑ کے جا پہونچے پتنگے ہی ہزاروں فارقؔ
اپنے مرکز پہ چراغِ سرِ منزل نکلا

(۱۱۳)

حُسن والے بھی نظر آتے ہیں سب سائل مجھے
تو نے یارب دیدیا ہے کیا انوکھا دل مجھے

منزلِ مقصود تھی میری نظر کے سامنے
لوگ سمجھا ہی کئے گم کردۂ منزل مجھے

چادرِ بحرِ فنا تھی رازِ انجامِ حیات
میں جہاں ڈوبا ہوا پیدا وہیں ساحل مجھے

ڈوبتے ہی کھُل گیا سب رازِ بحرِ زندگی
وہ نہ تھا ساحل نظر آتا تھا جو ساحل مجھے

تہ سے پھر گرداب نے مجھکو اُچھالا ایک بار
جب ہوا تھا آخری نظارۂ ساحل مجھے

بس یہ رنگینی خیالِ دوریٔ منزل کی تھی
سیکڑوں منزل کی فارقؔ ہو گئی منزل مجھے

۱۱۴

کوئی فریبِ نظر سا فریب کار نہیں
ابھی بہار تھی لیکن ابھی بہار نہیں

تری نگاہ کے صدقے یہ کیا تماشہ ہے
قرارِ دل کو ابھی تھا ابھی قرار نہیں

لہو کے ساتھ یہ رگ رگ میں دوڑتی پھرتی ہے
کہیں بھی اُنکی محبت کو اب قرار نہیں

وہ تم کہ اتنی جفا پر نہیں جفا پرور
وہ میں کہ اتنی وفا پر وفا شعار نہیں

وہ اشک کیا جو کسی کے نہیں شریکِ الم
وہ پھول خار ہے جو زینتِ مزار نہیں

ترے کرم کی بھی کچھ انتہا نہیں یارب
اگر گناہوں کا میرے کوئی شمار نہیں

یہی ہے فرق خزان و بہار میں فارقؔ
جب اختیار تھا دل پر اب اختیار نہیں

محمد بشیر الدین صاحب فارقؔ رئیس جاگیردار کوسی کلاں متھرا

۱۱۵

پھر چھیڑ کے دل خونِ دل سے لکھنے دو مجھے عنوانِ وطن
پھر دل میں تڑپ سی پیدا ہے، پھر روح میں ہے طوفانِ وطن

دیکھوں تو وطن میں کون ہے، وہ جو دل سے نہیں قربانِ وطن
حیوان سے بدتر دیکھا ہے، کیا تم نے کوئی انسانِ وطن

کیا میرے وطن کی چھاتی پر بستہ ہے کوئی ایسا دل بھی
گلشن جو لہو سے سینچ نہ دے آئے جو سوالِ شانِ وطن

فرزند جنے ہیں ایسے بھی کیا میرے وطن کی ماؤں نے
پل بڑھ کے وطن کی گود میں جو سب بھول گئے احسانِ وطن

اُبھرا ہے یہاں کی خاک سے کیا، ایسا بھی کوئی پتھر کا دِل
مٹی میں جو ملتی دیکھ سکے، تصویرِ جمالستانِ وطن

اپنے ہی گلے پر چلتی ہیں کیا تلواریں جانبازوں کی
جو جانِ وطن کہلاتے ہیں، کیا اُن میں ہیں دشمن جانِ وطن

اس پاک ہوا میں لیتے ہیں، سانسیں کیا ایسے انساں بھی
تھرّائیں نہ جن کے دل کی رگیں، جب روح سُنے اعلانِ وطن

کیا ایسے بھی صاحبِ غیرت ہیں، کیا اُن کے بھی سینے میں دل ہے
سینوں میں نہ جن کے ہُوک اُٹھے ہُن سُن کے غمِ پنہانِ وطن

اِس خاک سے ہم سب اُبھرے ہیں، اِس خاک میں ہمکو مِلنا ہے
پھر پھوٹ یہ کیسی آپس میں، کچھ غور کریں یارانِ وطن

حضرت فیاض الدین احمد خاں فیاض بی اے گوالیاری

(۱۱۶)

یہ ہوش ہے یا بیخودیٔ ہوش نُما ہے
اب تیری تمنا کو بھی دِل بھول رہا ہے

نظروں میں بھی جو اُٹھتی ہیں تو شوخی کے سہارے
ہر رنگ میں اک رنگ قیامت کا ملا ہے

بس ختم ہی ہوتی ہے محبت کی کہانی
آجاؤ کہ اب رشتۂ جاں ٹوٹ رہا ہے

دیوانے کی عالی نظری تم بھی تو دیکھو — دُنیا سے الگ ہو کے تمھیں دیکھ رہا ہے
یہ بھی ہیں مرے جوشِ تمنّا کے کرشمے — گم جیسے قفس ہی میں گلستاں کی فضا ہے

احساس کی لذّت بھی بڑی چیز ہے قاسم
اپنے کو بھی اب جیسے کوئی بھول گیا ہے

سید ہمراز حسین عمّانی قاسم نقوی

(۱۱۷)

لے جاؤں تجکو اے دلِ مضطر کہاں کہاں — بکھرے ہوئے ہیں حسن کے منظر کہاں کہاں
گنگا کے گھاٹ پر کبھی بنگلے کے لان پہ — برپا کئے ہیں ہم نے بھی محشر کہاں کہاں
چمپا کے سائے میں کبھی مہندی کی آڑ میں — ملتی تھیں روز رات کو چھپ کر کہاں کہاں
مسرور اپنی گوشہ نشینی پہ ہم رہے — پھرتے تمھاری یاد کو لیکر کہاں کہاں

قیصری نثار اُن کے تبسم پہ بار بار
غنچے کھلا رہی ہیں وہ ہنسکر کہاں کہاں

(۱۱۸)

میری نظر نظر میں سماتی چلی گئیں — ذرّے کو آفتاب بناتی چلی گئیں
معصومیٔ نگاہِ محبت تو دیکھئے — مجکو گناہگار بناتی چلی گئیں
ماضی کے واقعات سنورتے چلے گئے — جیسے مرے قریب وہ آتی چلی گئیں

(۱۱۹)

دِل کی چوری بتا رہی ہو تم — ہائے کیوں مسکرا رہی ہو تم
دِل سے دامن بچا رہی ہو تم — میری نظروں میں آ رہی ہو تم

جانے کیا کہدیا ہے غنچوں نے — شام سے یاد آ رہی ہو تم
وہ محبت کی پہلی پہلی نظر — ہائے کیسے بُھلا رہی ہو تم
پھول کیا جانیں کیسے ہنستے ہیں — اُن کو ہنسنا سکھا رہی ہو تم

ٹوٹ جاتا ہے جب کوئی تارا
دِل سمجھتا ہے آ رہی ہو تم

نوابزادہ جاوید قیصری کانپوری

(۱۲۰)

فلک سے آہ جو ناکامیاب ہو کے پھری — ہماری جان کو وہ بھی عذاب ہو کے پھری
نگاہِ یار جو مستِ شراب ہو کے پھری — جو با حجاب تھی وہ بے حجاب ہو کے پھری
جو بحرِ ہستی میں اک دم خرد ہوئی غوّاص — تو میری آنکھوں میں دُنیا حباب ہو کے پھری

تری تلاش میں ارض و سما پہ اے تاثیر
غریب آہ قمرؔ کی خراب ہو کے پھری

حضرت قمر لکھنوی

(۱۲۰)

زمیں سے عرش تک پہنچے زمین و آسماں ہو کر — مرے نالے کہاں ڈوبے کہاں نکلے کہاں ہو کر
نہ پہنچے گا کبھی زاہد یہاں ہو کر وہاں ہو کر — خدا کے گھر کی سیدھی راہ ہے کوئے بتاں ہو کر
زیادہ داغ دیکر روز تازہ گُل کھلاتے ہیں — ہمارے دِل میں وہ رہنے لگے اب باغباں ہو کر

خدا کے حسنِ قدرت کے لئے یہ مشغلہ ٹھہرا
عیاں ہونا نہاں ہو کر نہاں ہونا عیاں ہو کر

حضرت کشتہ

١٢٢

روٹھیں گے زُہد و مستیِ رندانہ ساتھ ساتھ
توڑوں گا آج توبہ و پیمانہ ساتھ ساتھ

دِل میں مسرتیں ہیں تو کچھ حسرتیں بھی ہیں
بستی سے ہے لگا ہوا ویرانہ ساتھ ساتھ

عاشق ہوں ایک وحدتِ کثرت نواز کا
رکھتا ہوں دِل میں کعبہ و بتخانہ ساتھ ساتھ

خود دار ہے نگاہ تو نانِ جویں میں دیکھ
طعمِ فقیر و خاصۂ شاہانہ ساتھ ساتھ

کھاتا ہے ٹھوکریں تو گُذرگاہِ یار کی
عقل و خرد بھی رکھتا ہے دیوانہ ساتھ ساتھ

ساغر میں دیکھتا ہوں شب و روز موجِ رقص
شیشے کے روپ میں ہے پریخانہ ساتھ ساتھ

ڈر ہے کہیں حرم نہ پہونچ جاؤ اے کلام
چلتی رہی جو لغزشِ مستانہ ساتھ ساتھ

١٢٣

عزمِ عمل کیا تھا کہ تقدیر ڈر گئی
سینہ سپر ہوئے تھے کہ شمشیر ڈر گئی

آزادگانِ دشتِ جنوں کی نہ پوچھیے
پھیلا دیئے جو پاؤں تو زنجیر ڈر گئی

یا رحمتیں ہیں میرے گُناہوں کی سرپرست
یا جرأتِ گُناہ سے تعزیر ڈر گئی

اچھا کبھی ہوا ہے نہ ہوگا مریضِ عشق
بیمار سے دواؤں کی تاثیر ڈر گئی

ہم لکھ رہے تھے حرفِ شکایت، وہ آگئے
ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تحریر ڈر گئی

اُمڈی گھٹائیں خوابِ جوانی کی چھُٹ گئیں
رات اِتنی ہولناک تھی تعبیر ڈر گئی

اللہ اللہ کہہ گیا صیّاد وقتِ ذبح
اِتنی تڑپ تھی صید میں تکبیر ڈر گئی

گُستاخیِ نگاہ تصوّر میں دیکھ کر
چہرہ کا رنگ اُڑ گیا تصویر ڈر گئی

چمکی جو برقِ حسن سرِ آشیاں کلام
تخریب کے خیال سے تعمیر ڈر گئی

۱۲۴

یہ آنسو نہیں ہیں شرر باریاں ہیں
جو چھینٹوں سے بھڑکیں وہ چنگاریاں ہیں

مرے جامِ رنگیں میں ہے عکسِ ساقی
ہم آغوش جلووں سے میخواریاں ہیں

اِدھر تم، اُدھر تم، یہاں تم وہاں تم
یہ جلوے نہیں ہیں فسوں کاریاں ہیں

تجلّی کی دعوت ہے تابِ نظر کو
سہولت بدوش آج دُشواریاں ہیں

حسینوں سے پرہیز تقویٰ نہیں ہے
ریاکاریاں ہیں، گنہگاریاں ہیں

کہاں کی جفا، ظلم کیسا، ستم کیا؟
حسینوں کی رنگیں اداکاریاں ہیں

وہ موجِ تبسّم وہ ٹھکرانا دِل کا
محبت میں ڈوبی دِل آزاریاں ہیں

میں بیخود ہوں لیکن تصوّر میں تیرے
یہ بیہوشیاں عین ہُشیاریاں ہیں

کفن دوش پر، ہاتھ میں فردِ عصیاں
کہاں کی کلامؔ آج تیاریاں ہیں

۱۲۵

درد ہے، غم ہے، دلِ ناکام ہے
اس کے آگے بس خدا کا نام ہے

زندگی سعی و عمل کا نام ہے
ورنہ اک رفتارِ صبح و شام ہے

چشمِ ساقی کی صلائے عام ہے
جام بھر بھر پی بخیر انجام ہے

اس تجاہل کا بھی ہے کوئی جواب
پوچھتے ہیں "کون ہو کیا کام ہے"؟

کوئی تاپے اور کسی کا گھر جلے
غربت میں دُنیا اِسی کا نام ہے

فطرتِ مجبور کو کہتے ہیں صبر
بندگی بیچارگی کا نام ہے

جان دیتا ہے بتوں پر برہمن
کفر بھی اپنی جگہ اسلام ہے

جس طرف نظریں پھریں دُنیا پھری — اُن کے بس میں گردشِ ایام ہے
کِس قدر پُر درد ہے شعرِ کلامؔ
یہ خدا کے عشق کا انعام ہے

(۱۲۶)

فقیروں کی دُنیا نہ شاہوں کی دُنیا — مگر دلرُبا ہے گُناہوں کی دُنیا
نگاہیں حسیں ہیں تو دُنیا حسیں ہے — یہ دُنیا ہے رنگین نگاہوں کی دُنیا
شباب آیا، شرم و حیا ساتھ آئی — غضب ہے یہ نیچی نگاہوں کی دُنیا
بصارت ہو دیکھیں، بصیرت ہو دیکھیں — یہ دُنیا نہیں کم نگاہوں کی دُنیا
شب و روز رونق پہ ہیں میرے دم سے — یہ نالوں کی دُنیا یہ آہوں کی دُنیا
کہیں جامِ کوثر کہیں حور و غلماں — ہے رنگیں بہشت دیں پناہوں کی دُنیا
کلامؔ اپنے پیروں فقیروں سے کہنا
بسائیں جو گم کردہ راہوں کی دُنیا

(محمد یعقوب خاں صاحب کلامؔ بی اے سہارنپوری)

(۱۲۷)

اب جا کے محبت میں تکمیل کو پہونچا ہوں
وہ میری تمنّا ہے میں اُس کی تمنّا ہوں
وہ حسن کا مرکز ہے میں شوق کی دُنیا ہوں
وہ محوِ تجلّی ہے میں محوِ تماشا ہوں
اللہ رے جنوں میرا، اللہ رے مری وحشت

ہنستا ہوں تو ہنستا ہوں روتا ہوں تو روتا ہوں
برباد نہ کر ظالم تو اپنی اداؤں کو
میں بھی ترا پرتو ہوں میں بھی ترا جلوا ہوں
بے کیفیٔ الفت کا عالم ہے اب یہ کوثرؔ
اک نام ہے جینے کا مرتا ہوں نہ جیتا ہوں

حضرت کوثرؔ عابدی

(۱۲۸)

جرأتِ دید نہیں اور وہ روپوش نہیں
جلوے ہر سمت تڑپتے ہیں مجھے ہوش نہیں
مستی و بادہ و مینا کی نہیں قید کوئی
آنکھ جس رنگ میں دیکھے اُسے روپوش نہیں
عکس آئینۂ دل تھا کہ وہ جلوہ اُن کا
پوچھنے والے یہ ابتک بھی مجھے ہوش نہیں

(۱۲۹)

پردہ اُٹھنے دو حقیقت رونما ہو جائے گی
مجکو مٹنے دو محبت آشنا ہو جائے گی
موتیوں پر اپنے اے شبنم ابھی نازاں نہ ہو
دھوپ پڑتے ہی تری دولت ہوا ہو جائیگی
اُٹھتے اُٹھتے اُٹھ ہی جائے گا حجابِ امتیاز
ہوتے ہوتے وہ ہی تدبیرِ رسا ہو جائے گی
سامنے ساحل ہے کشتی کو خدا پر چھوڑ دے
دیکھ تو موجِ تلاطم ناخدا ہو جائے گی
پھول کھلتے ہی بہار آتی ہے گلشن دیکھئے
اب فریبِ رنگ و بُو کی انتہا ہو جائے گی

(۱۳۰)

مجھے خود بھی نہیں معلوم حدِ جستجو میری
کہ دل یکسو ہے میرا اور نگاہیں چارسو میری

فرشتے فردِ عصیاں اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں | مرے اشکِ ندامت نے بڑھا دی آبرو میری

بہارِ گلشنِ ایجاد سے دل بھر گیا گلشن
نظر کب تک رہے آخر اسیرِ رنگ و بو میری

حضرت جینتی پرشاد گلشن رامپوری

(۱۳۱)

دلدادۂ ادائے مستانہ ہو گیا ہوں | قربان حسنِ روئے جانانہ ہو گیا ہوں
اتنا مٹا دیا ہے ہستی کو عاشقی میں | اب ایک جزوِ خاکِ بتخانہ ہو گیا ہوں
کیا دیکھتے ہو مجکو تصویرِ سوزِ غم ہوں | جل جل کے مر رہا ہوں پروانہ ہو گیا ہوں
میرا خیال ہے یہ، جاگا نصیب میرا | انکی نگاہ میں میں دیوانہ ہو گیا ہوں
جس روز سے کسی کو دل اپنا دیدیا ہے | نظروں میں اک جہاں کی بیگانہ ہو گیا ہوں
آزاد اگر رہوں گا فتنے اٹھیں گے لاکھوں | زنداں میں چل کے رکھو دیوانہ ہو گیا ہوں
بزمِ جہاں میں جس کو کوئی نہ منہ لگائے | قسمت کے پھیر سے وہ پیمانہ ہو گیا ہوں
کیا جانے یاد میری آئے نہ آئے انکو | بھولا ہوا کسی کا افسانہ ہو گیا ہوں

ہے آج کل منوّر کچھ ایسی دل کی حالت
دنیا سمجھ رہی ہے دیوانہ ہو گیا ہوں

(۱۳۲)

کسی کا گریباں جہاں چاک دیکھا | اُسے ہم نے اپنا گریبان جانا
حقیقت میں تھی خونِ ارماں کی سرخی | جسے خطِ قسمت کا عنوان جانا
بھلا کفر کو کفر کس طرح سمجھیں | جب ایمان ہی کو نہ ایمان جانا

اگر کچھ بھی اپنی حقیقت نہ جانی — تو کیا خاک پھر تُو نے انسان جانا
اسی سے ہوئے لاکھ غم دل میں پیدا — جسے راحتِ دل کا سامان جانا
کچھ ایسی ہی تھی کفر میں شان پیدا — کہ اپنے لئے اس کو ایمان جانا

تمھارے لئے مصلحت ہے اسی میں
منوّر جو کچھ وہ کہیں مان جانا

(۱۲۳)

ستم دیکھتے ہیں کرم دیکھتے ہیں — ہر انداز میں تجکو ہم دیکھتے ہیں
خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں — ان آنکھوں سے کچھ اور ہم دیکھتے ہیں
کریں گے کسی روز تنقید اس پہ — ابھی رنگ دُنیا کا ہم دیکھتے ہیں
وہیں آشیانہ بناتے ہیں اپنا — جہاں چار تنکے بہم دیکھتے ہیں
لگادے کوئی آگ دل میں لگادے — ہم اس ساز میں سوز کم دیکھتے ہیں
ہمیں بند آنکھوں سے تم دیکھتے ہو — تمھیں بند آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں
جُدا حُسن اور عشق کی گو ہیں راہیں — انھیں پھر بھی ہم ہم قدم دیکھتے ہیں
نہ اُٹھتے الٰہی زمیں سے نہ اُٹھتے — وہ سر جن کو سجدے میں خم دیکھتے ہیں
نظر کچھ نہ رکھتے ہیں سود و زیاں پر — نہ اب جانبِ بیش و کم دیکھتے ہیں

سر آنکھوں سے تیرا فسانہ لگاکر
منوّر کا حُسنِ رقم دیکھتے ہیں

حضرت منوّر لکھنوی

۱۳۴

جمالِ دوست جو ہو جائے بے نقاب کبھی
ستارہ بن کے بھی نکلے نہ آفتاب کبھی

عجب نہیں جو کرم بے حساب ہے تیرا
نہ ہو سکا مرے عصیاں کا بھی حساب کبھی

کسی کی مست نظر نے جسے پلادی ہو
نہ ہوگا بھول کے وہ مائلِ شراب کبھی

بنا دے عشق اسے اپنی طرح لافانی
اگر نہ حسن کرے اس سے اجتناب کبھی

سناؤں کس کو میں رودادِ سوزِ محرومی
کہ لا سکے گا نہ کوئی بھی اسکی تاب کبھی

کہاں وہ حسنِ لطافت، کہاں یہ حسرتِ غم
نہ آئے آنکھوں میں یارب پھر ایسا خواب کبھی

میں خود کو وقفِ غمِ حسن و عشق رکھوں گا
کوئی تو دے گا مجھے دادِ انتخاب کبھی

کمالِ ہستیٔ فانی کا عکس ہے اس میں
بغور دیکھئے آئینۂ حباب کبھی

جو میرے گریۂ پیہم کے دیکھ لیں طوفاں
نہ اشکبار ہوں منظورؔ پھر سحاب کبھی

حضرت منظور مشرقی

۱۳۵

چھوڑ دیں کس طرح قدرت ہی نہیں
ترکِ مے رندوں کی فطرت ہی نہیں

ہو گیا کیا آدمی کو اے خدا
کچھ خیالِ آدمیت ہی نہیں

لاکھ تڑپیں، لاکھ کوندیں بجلیاں
اضطرابِ دل سے نسبت ہی نہیں

کیا سبق انسان اس دنیا سے لے
چشمِ انساں میں بصیرت ہی نہیں

اب بہاریں کیوں نہیں دیتیں مزا
وہ جنوں وہ جوشِ وحشت ہی نہیں

نامرادیٔ مسلسل مرحبا!
وہ مرا دل، وہ طبیعت ہی نہیں

یوں مصیبت میں یہ ہو جب بات ہے — تم پہ گویا کچھ مصیبت ہی نہیں

ہم ہیں نشترؔ خوگرِ ضبطِ فغاں
وہ سمجھتے ہیں محبت ہی نہیں

۱۳۶

اِنساں اگر نہ پائے تمنّا کہیں جسے — دُنیا نظر نہ آئے وہ دُنیا کہیں جسے

ممکن نہیں کہ ڈھونڈھ نکالیں ہم تمھیں — ابتک کیا کہاں ہے، ارادا کہیں جسے

کیا تو نے سحر کردیا اے دُشمنِ بہار — اب رنگِ باغ وہ ہے کہ صحرا کہیں جسے

پھر آج بیخودی میں کمی پا رہا ہوں میں — ہاں، اک نگاہ، حاصلِ صہبا کہیں جسے

تم کیا مری نگاہ سے اوجھل ہوئے کہ اب — دُنیا ہی وہ رہی نہیں، دُنیا کہیں جسے

دِن ہو کہ رات گریۂ پیہم سے کام ہے — وہ سیل آنکھ میں ہے کہ دریا کہیں جسے

دِل میں، جگر میں، سینے میں، چشمِ پُر آب میں — چاروں طرف ہے درد کی دُنیا کہیں جسے

نشترؔ نہ کھا فریب طلسمِ مجاز کا
اِک محشرِ خیال ہے، دُنیا کہیں جسے

۱۳۷

پاس ہی میرے سہی، لیکن ضرور اتنا تو تھا — عمر بھر ڈھونڈھا کیا میں تجھکو، دور اتنا تو تھا

زندہ رہکر عشق میں جلنا ہے تہذیبِ وفا — جان پروانے نے دیدی بے شعور اتنا تو تھا

میں نے مانا کچھ نہ تھا بادہ کشی میں واعظا — دِل میں اور آنکھوں میں تھا ہر دم سرور اتنا تو تھا

کیوں نہ ہوتا مستحقِ رحمتِ پروردگار — سر سے پا تک تھا میں تصویرِ قصور اتنا تو تھا

سب مجھے بھولے ہوئے تھے رنج و آلامِ جہاں — عشق میں تیرے مجھے حاصل سرور اتنا تو تھا

خیر مانا میں نے نشترؔ کچھ نہ تھا میرا قصور
میں قصور اُن کا سمجھتا تھا، قصور اتنا تو تھا

(۱۳۸)

بیتابیٔ دِل تو نے مجھکو ہر طرح سے رُسوا کر نہ دیا
کمبخت محبّت کو میری دُنیا میں تماشا کر نہ دیا

ہم کہتے نہ تھے ارمانِ وفا دُنیا میں نہیں ہوتا اچھّا
بربادیٔ دِل کا سب ساماں ظالم نے مہیّا کر نہ دیا

اے یاس اِسی دن کی خاطر دِن رات میں تجھسے ڈرتا تھا
رفتہ رفتہ تو نے آخر بیزارِ تمنّا کر نہ دیا

ہم کہتے نہ تھے اے چارہ گرو! یہ درد علاج پذیر نہیں
آخر تم نے ضد سے اپنی درد اور زیادہ کر نہ دیا

ہر روز میں تم سے کہتا تھا بیتاب نہ یوں ہر دم رکھّو
اپنے کو رُسوا کر نہ لیا آخر مجھے رُسوا کر نہ دیا

ہم کہتے نہ تھے اک روز یہی ہونا ہے محبّت میں نشترؔ
تُو نے نہ سُنی میری آخر۔ اپنوں کو پرایا کر نہ دیا

(۱۳۹)

کیا بات ہے کیا ہو گئی کچھ میری نظر اور
تم آئے تو اب کچھ نظر آنے لگا گھر اور

بندہ ہوں قناعت کا مجھے اس سے نہیں کام
اب حرص و ہوا سے کہو دیکھیں کوئی گھر اور

کافی نہیں اب درد کو دل ایک جگر ایک
مل جائیں الٰہی! مجھے دِل اور جگر اور

اِس بزم سے اُٹھنے کو طبیعت نہیں ہوتی — جی چاہتا ہے دیکھ لوں پھر ایک نظر اور

کافر ہو جو عاجز ہو غمِ عشق سے نشترؔ
ہم اور بھی لے لیں۔ ہو غمِ عشق اگر اور

(۱۴۰)

اگر ہم زمیں ہیں تو عرشِ بریں تم — بھلا کیا ٹھکانہ کہیں ہم کہیں تم
نگاہوں میں رہنا دمِ واپسیں تم — بُرے وقت دھوکا نہ دینا کہیں تم
نہ دُنیا رہی ہے، نہ دُنیا رہے گی — رہے ہیں ہمیں تم، رہینگے ہمیں تم
فراموش کر کر کے روز اپنے وعدے — ہمیں بھول جانا نہ یونہی کہیں تم
بُرا حال ہے آج قلب و جگر کا — میرے پاس ایسے میں ہوتے کہیں تم

خدا کی قسم واقعہ ہے یہ نشترؔ
بناتے ہو گُلشن غزل کی زمیں تم

(۱۴۱)

رات دِن سر پہ محبت میں بلائیں آئیں — ہم نے ہر چند یہ چاہا کہ نہ آئیں، آئیں
راس آئیں نہ دوائیں نہ دعائیں آئیں — کام اگر عشق میں آئیں تو وفائیں آئیں
کچھ تعلق ہے جوانی کو جفاؤں سے ضرور — یہ جہاں آئیں حسینوں کو جفائیں آئیں
نہ سُنیں غور سے نادان نے آخر نہ سُنیں — عمر بھر کان میں انساں کے صدائیں آئیں
پھر کہاں رہتی ہے تاریکیِ نااُمیدی — دِل میں اُمید کی جس وقت ضیائیں آئیں

وائے بر حالِ مریضِ غمِ فُرقت نشترؔ
در پہ وہ آئے کہ ماتم کی صدائیں آئیں

(۱۴۲)

آنسو غمِ محبوب میں ہر وقت پئے کون
مر مر کے اِسی طرح شب و روز جیے کون؟

اے بادِ صبا ہاتھ جو تیرا نہیں اس میں
کر جاتا ہے ٹھنڈے مری تُربت کے "دیئے" کون؟

اس طرح نہ آسودگی ہو گی کبھی ساقی
خُم منہ سے لگا لے مرے ساغر سے پئے کون؟

اے ضبط جگہ دے کہ یہ آنکھوں سے نکل جائیں
یوں آنکھ میں ہر وقت بھرے اشک لیئے کون؟

ہو عشق و محبت میں اگر لطف نہ بیحد
ہر روز محبت میں مرے اور جیئے کون؟

دیکھو یہ کہیں حضرتِ نشتر تو نہیں ہیں
پھرتا ہے یہ سامانِ جنوں کے سے لئے کون؟

(۱۴۳)

دیکھ خوشیاں رنج دیکھ آلام دیکھ
جو دِکھائے گردشِ ایام دیکھ

اہل ہونا عشق کا آساں نہیں
پہلے ہر تکلیف میں آرام دیکھ

آمدِ پیری سے گھبراتا ہے کیوں
زندگی صبح دیکھی شام دیکھ

حُسن سے رکھتا ہے ارمانِ وفا
یہ مرے دِل کا خیالِ خام دیکھ

بیٹھتے دِل کا مرے عالم نہ پوچھ
ڈوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ

میں نہیں کہتا کہ کر لے آنکھ بند
صرف دُنیا کو برائے نام دیکھ

آنکھ پُر نم اور دِل مجروح ہے
نشتر اپنے عشق کا انجام دیکھ

(۱۴۴)

نہیں یہ انصاف حسن کو تو، اگر سکوں انتساب کر دے
کیا ہے مجھکو تو اے محبت ۔ اُسے بھی خانہ خراب کر دے
بنا نہ آئینہ انجمن کا، تو پھر شریکِ نقاب کر دے
مری نگاہوں کو، چھپنے والے کسی طرح کامیاب کر دے
کہاں تلک آخر یہ تیرہ بختی، رہیگی قائم یوں ہی الٰہی
مری شبِ تارِ ہجر کو بھی، کبھی شبِ ماہتاب کر دے
محبت اپنی تمام قوت کے ساتھ انسان پر ہے حاوی
کسی کو خانہ بدوش کر دے کسی کو خانہ خراب کر دے
نہ ہو جو ممکن حصولِ عقبیٰ بغیر اِس کے کسی طرح بھی
ہماری عقبیٰ بنا دے یا رب، ہماری دُنیا خراب کر دے
محبت اور اُس کے راز نشتر سمجھ میں آئینگے آتے آتے
کتاب تو ہے نہیں محبت، جو کوئی نقلِ کتاب کر دے

(۱۴۵)

وہ ناداں ہیں جو سمجھیں زندگی حدِ قضا تک ہے
حقیقت میں اُسی کے بعد ہے سب کچھ، بقا تک ہے
مرے نزدیک محرومی کہیں بہتر ہے دُنیا میں
کہ آخر مُدّعا بھی تو حصولِ مُدّعا تک ہے
ہمارا سا بھی شاید ہی کسی کا ہوگا افسانہ

عجب اِک بیخودی سی اِبتدا سے اِنتہا تک ہے

قضا کی حد سے آگے بڑھ کے ہو تو ہے بقا حاصِل
وہ کوئی زندگی میں زندگی ہے، جو قضا تک ہے

رسا جس روز ہو گی یہ، مزہ آجائے گا نشتر
مِری محرومیِ تقدیر، آہِ نارسا تک ہے

۱۴۶

صبح تک مجھکو جگانا شام سے
میں تو عاجز ہوں دلِ ناکام سے

نام تیرے سیکڑوں ہیں، یہ بتا
ہم تجھے آواز دیں کِس نام سے

جان چھوڑے گی کبھی تو زندگی
ہم کبھی تو سوئیں گے آرام سے

شام کا وعدہ ہے اُس سے اے خدا
صبح کی سرحد ملا دے شام سے

وصل کی شب کا کہیں کیا اِختصار
صبح آجاتی ہے ظالم شام سے

چھُپ گیا ہے دل تمنّاؤں میں یوں
جس طرح سورج غُبارِ شام سے

چار دِن کی زندگی کا کیا گلہ
کٹ گئی تکلیف یا آرام سے

تیری بھی سُن لینگے واعظ ایکدن
مل گئی فرصت جو شغلِ جام سے

یونہی کیا کم تھے حجاب اندر حجاب
دل بھی تو نے بھر دیا اوہام سے

اُس کا ملنا ہے، ملے جو بے غرض
یوں تو سب ملتے ہیں اپنے کام سے

صبح سے تا شام تیرا انتظار
رات بھر اختر شماری شام سے

آ نہ جائے اِس میں دُنیا کی خوشی
دِل کو بھر لے عشق کے آلام سے

ہائے یہ ہر وقت تیرا انتظار
باز آیا ایسی صبح و شام سے

آج ساقی آنکھوں آنکھوں میں پلا جام میں آنے دے سیدھی جام سے
موت کہتے ہیں جسے وہ ہے فقط سیر ہو جاتا غمِ ایام سے
بیوفاؤں سے تجھے چشمِ وفا
باز آ نشتر خیالِ خام سے

۱۴۷

کیوں جوشِ رقابت سے دیوانہ نہیں ہوتا پروانے کا دُشمن کیوں پروانہ نہیں ہوتا
میخانہ بھی بے ساقی میخانہ نہیں ہوتا جبتک وہ نہ خود ڈھالے پیمانہ نہیں ہوتا
جس طرح ہو لے ساقی یہ ہوش مرا لے لے اس ہوش کے مارے میں دیوانہ نہیں ہوتا
کیا میرا ہی افسانہ ہے سلسلۂ ہستی کیوں ختم مرے دل کا افسانہ نہیں ہوتا
ہوتا ہے کوئی ٹکڑا افسانے کا افسانہ پورا کوئی افسانہ افسانہ نہیں ہوتا
اُسوقت کوئی دیکھے نشتر کی پریشانی
جب ہاتھ میں حضرت کے پیمانہ نہیں ہوتا

۱۴۸

سوز بن کر دِل میں آ، یا ساز بن کر دِل میں آ
تیری منزل ہے کسی صورت سے اِس منزل میں آ
یوں تو وہ اِس زندگی میں راستے پر آچکا
تُو ہی اے منزل رہِ گُم کردۂ منزل میں آ
آرزوئیں پوچھ لے، اِکدن، دلِ ناشاد کی
یا بُلا محفل میں اپنی، یا میری محفل میں آ

کوئی مجھ سا بھی نہ ہوگا، رازِ دِل سے بے خبر
جو میرے دِل میں ہے، اُس سے کہہ رہا ہوں دِل میں آ

اے خیالِ یار یوں آنے کا میں قابل نہیں
نام جانے کا نہ لے، اِس طرح میرے دِل میں آ

ہر تمنّائے محبّت میں ہیں نئو نئو لذّتیں
کِس سے میں کہدوں چلی جا، کِس سے کہدوں دِل میں آ

آج وہ شوقِ شہادت ہے کہ نشترؔ الاماں
تیغِ قاتل سے کوئی کہدے کفِ قاتل میں آ

۱۴۹

میں بے عزم و بے مُدّعا جا رہا ہوں
جدھر دِل میں آئی چلا جا رہا ہوں

سمجھتا یہ ہوں، زندگی بڑھ رہی ہے
حقیقت میں سُوئے فنا جا رہا ہوں

محبّت کا رستہ بھی کیا بے خطر ہے
نہ ساتھی نہ رہبر، چلا جا رہا ہوں

حقیقت سمجھتا ہوں میں زندگی کی
مگر پھر بھی اِس پر مرا جا رہا ہوں

گرفتارِ موجِ ہوا ہو گیا ہوں
جدھر بہہ رہا ہوں بہا جا رہا ہوں

پھر اُس بزم میں آج تنگ آ کے دِل سے
بُرا ہو کہ نشترؔ بھلا۔ جا رہا ہوں

۱۵۰

اس عقل و خرد کی دُنیا میں ہُشیار نہ رکھ غافل کر دے
رہنے کے نہیں قابل دُنیا، رہنے کے مجھے قابل کر دے

دِل ایک ہے اور ارمان بہت، گھر ایک ہے اور مہمان بہت
ممکن ہو اگر تو حُسن ذرا، توسیعِ مکانِ دِل کر دے

یوں میری رسائی منزل تک دُشوار نہیں، ناممکن ہے
میں تھک کے جہاں پر بیٹھ رہوں، اُسکو ہی میری منزل کر دے

غفلت میں وہ دیکھا ہے میں نے، جو ہوش میں دیکھا تھا نہ کبھی
میں ہوش سے اپنے باز آیا، لِللہ مجھے غافل کر دے

ہو عشق مجازی بھی تو کیا، لیکن ہے وہ ہی عشق اے نشتر
اِنسان کو جو اِنساں کر دے، جو دِلکو یقیناً دِل کر دے

(۱۵۱)

ضوفگن جلوہ تیرا دِل کے نہاں خانے میں ہے
لاکھ ویرانہ سہی رونق تو ویرانے میں ہے

لُطفِ منزل کیا جو قائم رہ گئے ہوش و حواس
لُطف پانے میں نہیں ہے، بلکہ کھو جانے میں ہے

زندگانی جسکو کہتے ہیں جہانِ عشق میں
سر سے لیکر پاؤں تک وہ درد بن جانے میں ہے

اُنکی آنکھیں کہہ رہی ہیں آج اُنکے دِل کا حال
کل جو خُم میں ہو جزن تھی، آج پیمانے میں ہے

ڈھونڈھتی ہے جسکو دُنیا کعبہ و بُتخانہ میں
وہ نہ کعبے میں ہے نشتر اور نہ بُتخانے میں ہے

(۱۵۲)

سعیٔ تا حدِ حریمِ ناز ہونا چاہیئے
ہوش کو اب مایلِ پرواز ہونا چاہیئے

جانے کب آ جائے ندائے غیب اُسکے کان میں
آدمی کو گوش بر آواز ہونا چاہیئے

دیکھ سکتی ہے نظر، ہر نیرنگیٔ کون و مکاں
دِل کی آنکھوں کو کرشمہ ساز ہونا چاہیئے

نام لب پر ہے کسی کا آنکھ میں تصویر ہے
اس اجل پر زندگی کو ناز ہونا چاہئے
دل کی خواہش ہے کہ رازِ عشق پوشیدہ رہے
آنکھ کہتی ہے کہ افشا راز ہونا چاہئے
کیا تنفس ہے اور نشتر کیا قفس کی تیلیاں
حوصلوں میں قوتِ پرواز ہونا چاہئے

ہرگوبند دیال صفا نشتر تمرگامی اودی

(۱۵۳)

یاسِ ناکامی سے جس قلب مضطر ہوگیا
اب ترا ملنا نہ ملنا سب برابر ہوگیا
میری اُلفت تیرے دل میں کیوں نہیں پاتی جگہ
داخل آئینے میں تیرا عکس کیونکر ہوگیا
آپ کا بیمارِ غم اور ضعف کی مجبوریاں
ساری دُنیا کا خلاصہ ایک بستر ہوگیا
میرے مرنے کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں لوگ
اپنے گھر محشر سے پہلے ایک محشر ہوگیا
اس سے بڑھ کر اور کیا ہے سادہ لوحی عشق کی
آپ نے وعدہ کیا اور مجھکو باور ہوگیا
آج سُنتا ہوں وہ آتے ہیں عیادت کیلئے
کیا مریضِ ہجر کا وعدہ برابر ہوگیا
ایک ذرے کے برابر اپنے دل میں تھا جو داغ
بڑھتے بڑھتے آفتابِ روزِ محشر ہوگیا
اور کیا تکلیف دے گی خارِ حسرت کی خلش
دل میں اک قطرہ لہو کا ایک نشتر ہوگیا
تو ہی دیدے اے رگِ جاں خشک آنکھوں کو لہو
دل کا سرمایہ تو نذرِ دیدۂ تر ہوگیا
آپ نے تو بال اپنے ناز سے بکھرا دئے
اور یہاں مجموعۂ خاطر ہی ابتر ہوگیا
اب یہ حالت ہے کہ لیٹے بھی ہوئے جاتے ہیں غیر
ایک جسمِ ناتواں تک بارِ بستر ہوگیا
اپنی نظروں میں جو ہے آنکھی جوانی کی بہار
خار پر جب آنکھ ڈالی اک گُلِ تر ہوگیا
خاکساری کی جو عادت تھی تو آخر اے نظر
خاک میں ملنے کے قابل جسمِ لاغر ہوگیا

۱۵۴

طولِ غم سے مختصر غم کی کہانی ہوگئی ۔ جب بھری اک آہ دِل کی نوحہ خوانی ہوگئی
ختم دلچسپی تری اے دارِ فانی ہوگئی ۔ ہم بھی زندہ تھے کبھی وہ زندگانی ہوگئی
ہر قدم پہ ایک نالہ، ہر نفس پر ایک آہ ۔ زندگی کیا ایک شرحِ سخت جانی ہوگئی
ہجر میں آنکھوں سے جاری ہے برابر سیلِ اشک ۔ بند دو کوزوں میں دریا کی روانی ہوگئی

مے کو دُنیا آتشِ سیّال کہتی ہے نظرؔ
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہوگئی

منشی نوبت رائے صاحب نظرؔ لکھنوی مرحوم

۱۵۵

جلنے کو شمع بنے مٹنے کو پروانہ بنے ۔ عشق میں تیرے کوئی کیا بنے کیا کیا نہ بنے
راز افشا وہ کرے اپنا جو بیگانہ بنے ۔ خونِ دِل ہی نہ کہیں سُرخیِ افسانہ بنے
جس جگہ بیٹھ کے پی لوں ہی میخانہ بنے ۔ دونوں ہاتھوں کو جہاں باندھ لوں پیمانہ بنے
دِل کے دو ٹکڑے اس انداز سے کردے قاتل ۔ ایک کا کعبہ بنے ایک کا بُتخانہ بنے
آتشِ عشق میں جلنے کا مزہ تب آئے ۔ دِل جلے خاک بنے، خاک سے پیمانہ بنے

ہے یہ ساقی کی نگاہوں میں اثر دیکھ نسیمؔ
آنکھ جس پھول پہ پڑ جائے وہ پیمانہ بنے

حضرت نسیمؔ

(۱۵۶)

چلنے کی سکت اب مجھ میں کہاں بیمار ہوں میں ناچار ہوں میں
اے میرے عصائے پیری تو پہونچا دے مجھے میخانے تک

محفل میں ساقی خود بیں سے اُمید نہیں فیّاضی کی
کیا دیکھتے ہو اے تشنہ لبو خود جا پہونچو پیمانے تک

ہے وقتِ سحر خاموش بھی ہو تُو اور جلائے گی کس کو
اے شمعِ فروزاں تیری پہونچ ہوتی ہے فقط پروانے تک

تھے اور بھی خرمن رستے میں کیا اُن کو جلانا مُشکل تھا
کیوں چھوڑ کے سب کو آئی ہے اے برق مرے کاشانے تک

تُو دیکھے سوکھے تنکوں کو، میں ڈھونڈھوں دل کے ٹکڑوں کو
اے بُلبُلِ بیکس ہم دونوں آ مِل کے چلیں ویرانے تک

وہ زُہد میں راز و نیاز کہاں جو عشق میں ہے اعجاز نہاں
عاشق کی رسائی ہے بُت تک زاہد کی پہونچ بتخانے تک

یہ فکر ہے کیسی، کیسا غم، اِک روز نکل جائے گا دَم
ناشادؔ جہاں کے رنج و الم ہیں ساتھ فقط مر جانے تک

پرنسپل رام پرشاد لکھنوی سلاحضا ناشادؔ

(۱۵۷)

یہ چاہتے ہو کہ دُنیا رہے وفا نہ رہے
کوئی غریب محبت کا آسرا نہ رہے

تمھاری بیستیِ فطرت کو کیا کرے کوئی
خدا بنایا تھا بُت بن گئے خدا نہ رہے

زمانہ آج فراموش در گزر کر دے — ترا گناہ جو تجھکو پکارتا نہ رہے
تلاشِ عیب میں کیا کیا ہنر نہیں کھلتے — روش جو اہلِ نظر کی مخالفانہ رہے
یہ چاہتی ہیں تیری بے نیازیاں شاید — کسی کو شکر و شکایت کا حوصلہ نہ رہے

جنابِ نجمؔ یہ پوچھو جنابِ واعظ سے
رہے زمیں پہ گنہگار کوئی یا نہ رہے

(۱۵۸)

دیکھے دِل میں بیقرار دیکھتا چلا گیا — دور تک نگاہِ یار دیکھتا چلا گیا
اُسکو راہِ عشق پہ لے کے آئے بھی تو کیا؟ — اپنے حُسن کی بہار دیکھتا چلا گیا
چھیننے کی چیز تھا میرا عزمِ مستقل — انقلابِ روزگار دیکھتا چلا گیا
موت نے اُتار لی جب نقابِ زندگی — زندگی کا پردہ دار دیکھتا چلا گیا
کیا ضرور تھا کہ وہ غم کی بات پوچھ لے — دو جہاں کا غم نثار دیکھتا چلا گیا
کائناتِ حُسن تھی آئنہ در آئنہ — میں بہار در بہار دیکھتا چلا گیا
آئیں گے ضرور وہ اُن سے یوں کہے کوئی — اُن کی راہ جاں نثار دیکھتا چلا گیا
زندگی بھی خواب تھا اے خوابِ زندگی — خوشگوار و ناگوار دیکھتا چلا گیا
آہ کر رہا تھا جو سانس بھی نہ لے سکا — فیضِ جبر و اختیار دیکھتا چلا گیا
پھر خُمار و غم ہوا، غم کو پھر نظر لگی — پھر مجھے ستم شعار دیکھتا چلا گیا

عید ہی سہی مگر میکدہ میں ہم نہ تھے
نجمؔ ابرِ نو بہار دیکھتا چلا گیا

حضرت نجمؔ آفندی اکبرآبادی

۱۵۹

ہر نفس معمورِ سوز و ساز ہے | مجھکو اپنی زندگی پر ناز ہے
کیا یہ دردِ عشق کا آغاز ہے | کیوں مری رگ رگ میں سوز و ساز ہے
جذبۂ دل میں بھی کیا اعجاز ہے | ہر قدم پر اُس کی بزمِ ناز ہے
سازِ دل پر کون نغمہ ساز ہے | ذرّہ ذرّہ گوشش بر آواز ہے
اللہ اللہ نشّۂ صہبائے عشق | خود بہ خود دل مائلِ پرواز ہے
کیجئے کس کس ادا پر جاں نثار | ہر ادائے حسن فتنہ ساز ہے
مرنے والے موت سے ڈرتا ہے کیوں | موت ہی میں زندگی کا راز ہے
کر دیا بیگانۂ ہستی مجھے | میرے دل کا ساز بھی کیا ساز ہے
ٹکڑے ٹکڑے ہے دلِ مضطر مگر | پھر بھی مشتاقِ نگاہِ ناز ہے

کیوں فضا ہے کیف میں ڈوبی ہوئی
کیا دلِ نشتر ترنم ساز ہے

۱۶۰

تیرا ارماں نہ اگر درد میں شامل ہو جائے | سانس لینا بھی مجھے درد سے مشکل ہو جائے
جذبۂ عشق اگر جذبۂ کامل ہو جائے | ہستیٔ کون و مکان ہستیٔ باطل ہو جائے
دردِ دل کاش غم و درد کا حاصل ہو جائے | اتنا بڑھ جائے کہ محشر کے مقابل ہو جائے
چاہتا ہوں کہ اسے نذرِ محبت کر دوں | زندگانی مری شاید کسی قابل ہو جائے
عشق کی راہ میں آسودۂ منزل ہے وہی | سعیٔ منزل میں جو گم گشتۂ منزل ہو جائے
سرفرازیٔ محبت ہے اُسی کو حاصل | تیری محفل میں جو پروانۂ محفل ہو جائے

شرحِ سودائے محبت جو مجھے ہو منظور ذرہ ذرہ میری ہستی کا مرادل ہو جائے

لذتِ شعر و سخن سے ہے بقائے نشتر
ورنہ دو روز بھی جینا مجھے مشکل ہو جائے

(۱۶۱)

نہاں نہیں ہیں وہ جلوے دکھائے جاتے ہیں کہاں نہیں ہیں وہ ہر شے میں پائے جاتے ہیں
ہم اپنا رازِ محبت چھپائے جاتے ہیں بلا کا غم ہے مگر مسکرائے جاتے ہیں
وہ آئیں یا کہ نہ آئیں یہ اُنکے دل کی رضا ہم اُنکی راہ میں آنکھیں بچھائے جاتے ہیں
بجھا سکیں تپشِ دل اسی طرح شاید ہم اُنکی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں
تڑپ نہ اے دلِ ناکام آرزو نہ تڑپ ٹھہر ٹھہر وہ تصور میں آئے جاتے ہیں
قریبِ مرکزِ منزل ارے یہ ناکامی الٰہی خیر، قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
بنا رہے ہیں مجھے مست نرگسِ مخمور شرابِ عشق و محبت پلائے جاتے ہیں
شکستِ توبہ کہیں کی ہے آج زاہد نے نظر ہے مست قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

وہی ہیں رازِ حقیقت سے آشنا نشتر
جو راہِ عشق میں ہستی مٹائے جاتے ہیں

(۱۶۲)

چمن میں بھی تھا کیا زمانہ ہمارا بہاریں تھیں اور آشیانہ ہمارا
وہ کیفِ جوانی، وہ لطفِ محبت زمانہ تھا وہ بھی زمانہ ہمارا
بہاروں کی آغوش میں کھیلتے تھے چمن میں تھا جب آشیانہ ہمارا
تڑپ جائیگا اُف تڑپ جائیگا دل نہ سُنئے نہ سُنئے فسانہ ہمارا

نہ ڈھونڈھ اے صبا برگ و شاخ و شجر پہ — قفس میں ہے اب آشیانہ ہمارا
تری خاکِ رہ سجدہ گاہِ جبیں ہے — ترا نقشِ پا آستانہ ہمارا
وہ شبنم کا ماتم کے آنسو بہانا — وہ اُجڑا ہوا آستانہ ہمارا
جہاں چُن دیئے ہم نے دو چار تنکے — وہیں بن گیا آشیانہ ہمارا

کہاں ہیں وہ راحت کے ایام نشترؔ
کوئی خواب تھا وہ زمانہ ہمارا

(۱۶۳)

ترا جنوں ہے سمائی ہے دل میں بُو تیری — قدم قدم پہ میں کرتا ہوں جستجو تیری
نگاہ ہو تو کرے کوئی جستجو تیری — تجلیاں نظر آتی ہیں چار سُو تیری
شفق میں ہیں ترے جلوے گلوں میں بُو تیری — میری نظر سے کرے کوئی جستجو تیری
تمام رات کہاں مجھکو نیند آتی ہے — تیرے خیال سے کرتا ہوں گفتگو تیری
بیان و شرحِ تمنّا مجھے نہیں معلوم — یہ جانتا ہوں کہ ہے مجھکو آرزو تیری

ترے کرم میں ستم ہے ترے ستم میں کرم
ترے نثار سلامت رہے یہ خُو تیری

(۱۶۴)

غمِ جاں نہیں یا غمِ دل نہیں ہے — محبت میں کیا مجھکو حاصل نہیں ہے
نہ چھیڑو دُکھانے کے قابل نہیں ہے — جسے دل سمجھتے ہو اب دل نہیں ہے
حیاتِ دل و جاں ہے ہر وار اُس کا — وہ کہنے کو قاتل ہے قاتل نہیں ہے
نظر بس ہے لیلیٰ کے مجنوں ہی مجنوں — دکھانے کو محمل ہے محمل نہیں ہے

نہ ڈھونڈھے کوئی منزلِ راہِ اُلفت — یہ وہ راہ ہے جس کی منزل نہیں ہے
نہ پوچھے کوئی مجھ سے رودادِ اُلفت — یہ روداد کہنے کے قابل نہیں ہے
نہ چھیڑو خدا کے لئے اب نہ چھیڑو — دُکھا دِل دُکھانے کے قابل نہیں ہے
نہ جانے کہاں اب لگے میری کشتی — عیاں دور تک شکلِ ساحل نہیں ہے

یہ کس نے ترا حال پوچھا تھا نشترؔ
ابھی تک سکوں تجھکو حاصل نہیں ہے

حضرت جاگیشوردیال صاحب ایڈووکیٹ نشترؔ کانپوری

(۱٦۵)

کہو تم کو سجدوں کا مرکز بنا دوں — خدا کی خدائی میں ہل چل مچا دوں
درِ عشق پر حُسن کا سر جُھکا دوں — کہو آج یہ بھی تماشا دِکھا دوں
مرے درد کی انتہا بننے والے — کسی دن تجھے بھی یہ لذّت چکھا دوں
تری آنکھ نے کچھ کیا ہے اِشارہ — اجازت اگر ہو تو میں مُسکرا دوں
تمھیں اپنے گھر آج مہمان کر کے — کہو تو جہنّم کو جنّت بنا دوں
چُرا لے گئے تم مجھے دِل سمجھکر — تمھی خود بتاؤ تمھیں کیا سزا دوں
محبت، تمنا، اُمنگیں، جوانی — میں کِس کِس کو کوسوں کسے بد دعا دوں
فریبِ محبت کا کر کے بہانہ — گنہگار رو با محشر میں طوفاں اُٹھا دوں
تمھاری کہانی تمھی کو سُنا کر — کہو تو رُلا دوں، کہو تو ہنسا دوں
اگر سیکھ لو تُم مجھے یاد کرنا — خدا کی قسم میں خدا کو بھلا دوں
یہ جینا، یہ مرنا، یہ ہنسنا، یہ رونا — مرا بس چلے تو یہ جھگڑا چُکا دوں

بہت دِن سے دل میں تمنا ہے واؔحد
کسی کی تمنا سے دِل کو بسا دوں

حضرت واحدؔ قریشی لمبی

۱۶۶

آنکھ میں آنسو ۔ جگر میں داغ ۔ حسرت دِلمیں ہے
دردِ فرقت سے الٰہی جان کس مُشکِل میں ہے
رفتہ رفتہ عشقِ کامل نے دِکھایا یہ اثر
پہلے جو اُلفت تھی مجھ میں اب وہ اُنکے دِل میں ہے
جوشِ طوفاں شورِ دریا برقِ لرزاں بادِ تند
کشتئ عمرِ رواں یارب بڑی مُشکل میں ہے
اے نگاہِ نازِ تیری یہ تغافُل کیشیاں
لُطفِ تنہائی مجھے حاصل تیری محفل میں ہے
چھوڑ دے جو کچھ بچے ہیں تیر وہ بھی چھوڑ دے
ٹوٹ جائے جو طلسمِ زیست آب و گِل میں ہے
زندا باد اے رنجِ اُلفت جان و دِل تجھ پر نثار
کیونکہ یک تیرے سبب سے یاد اُسکی دل میں ہے
بزم میں برقِ نظر ہے صد تمنا آفریں
دِل میں ہے محفل کوئی یا دِل میرا محفل میں ہے
حُسن میں اُس شعلہ رو کے جتنی ہے گرمی ہر دیش
اُس سے کچھ زیادہ تپش دردِ جگر سے دِل میں ہے

١٦٧

ایک یہ دِل ہے جو سو جان سے شیدائی ہے — ایک تم ہو جو نہ ملنے کی قسم کھائی ہے

جسکے بدلے میں لُٹا ڈالی ہے دُنیائے نِشاط — وہ خلش دِلمیں چھپائے تیرا سودائی ہے

دیکھنے والے بھی رو دیتے ہیں اِس حالت پر — اب تیرے رحم کے قابل تیرا سودائی ہے

تیرے اعجاز کی ہے دھوم زمانے بھر میں — میں جو بچ جاؤں تو سمجھوں کہ مسیحائی ہے

حسرتِ دید سے تھا جان نکلنا مُشکِل — سعئ پیہم سے قضا ہونٹھ تلک لائی ہے

رفتہ رفتہ یہ ہوا کیفِ تصوّر کا اثر — دِل کے آئینہ میں تصویر اُتر آئی ہے

لاؤ دیکھیں کہیں میرا دِل گم گشتہ نہ ہو — آپ کہتے ہیں کہ اِک چیز پڑی پائی ہے

کِس قدر توبہ شِکن شوخ کی انگڑائی ہے — میکدہ گونج اُٹھا دیکھو گھٹا چھائی ہے

ہو گیا چاک جگر ناز کے تیروں سے ہردیش
اِک کماں حسن کی ہے یا تیری انگڑائی ہے

پنڈت ہردے نراین پانڈے ہردیش کانپوری

١٦٨

دو گھڑی کے واسطے دِل شاد کر لیتا ہوں میں — جب مِلی فرصت تمھاری یاد کر لیتا ہوں میں

یاد کر کے آپکو دِل شاد کر لیتا ہوں میں — خانۂ بربادیوں آباد کر لیتا ہوں میں

دِل بہلنے کا کوئی جب آسرا ملتا نہیں — آسماں کو دیکھ کر فریاد کر لیتا ہوں میں

موت کا جب دھیان آجاتا ہے مجکو ہمنشیں — زندگی بھر کے فسانے یاد کر لیتا ہوں میں

انکی فِطرت ہے کہ مجکو بھول جاتے ہیں مگر — میری عادت ہے کہ انکو یاد کر لیتا ہوں میں

چار دِن کے واسطے یہ جسمِ خاکی میں ہے قید — جان دیکر روح کو آزاد کر لیتا ہوں میں

۱۶۹

ردۂ دل کی آڑ میں نیرنگِ نگاہِ ناز ہے — دل میں چھپا ہے اِس طرح جیسے کسی کا راز ہے

ردہ کشائے برقِ طور عشق کا سوز و ساز ہے — بزمِ خیالِ آرزو اُن کی حریمِ ناز ہے

ردے سے جب خلش بڑھی، ضعف سے سر جھکا لیا — مذہبِ عشق کی قسم اپنی یہی نماز ہے

ونوں گھروں میں اُسکا نور، پردہ کہیں کہیں ظہور — دیر تو جلوہ گاہ ہے، کعبہ حریمِ ناز ہے

۱۷۰

میں کہنے سے تیرے اُٹھا جا رہا ہوں — مگر سوچ لو بے خطا جا رہا ہوں

مرے دل کی وسعت تو دیکھ لے ستمگر — دئے پھر بھی تجکو دعا جا رہا ہوں

پتہ سیرِ منزل کا ہے بیخودی کو — لئے جا رہی ہے چلا جا رہا ہوں

یہ کیا کم ہے عالم مری بیکسی کا — کہ ساحل سے لگ کر بہا جا رہا ہوں

تماشائے دُنیا میں دیکھوں تو کیوں کر — میں خود ہی تماشا بنا جا رہا ہوں

۱۷۱

بسر ہوتی ہے اِس صورت سے بیمارِ محبت کی
اگر دن ہیں مصیبت کے تو راتیں ہیں قیامت کی

یہ ہستی خود کمالِ نیستی کا اِک نمونہ ہے
مجاز اپنا بھی گویا ایک صورت ہے حقیقت کی

اگر عُشاق چاہیں آپ کو بُت سے خدا کر دیں
کہ ہے عشقِ مجازی آخری سیڑھی حقیقت کی

اندھیری رات کے روشن ستارے خضرِ منزل ہیں

حقیقت میں انھیں سے راہ ملتی ہے حقیقت کی
محبت زندگی ہے اِس کو بیماری کہا کِس نے
اِسی کے دم سے ساری گرمیاں ہیں بزمِ قُدرت کی
خدائی اور بھی کیا کیا ستم ڈھاتی خدا جانے
اگر ہوتیں نہ اِتنی بندشیں قانونِ قُدرت کی
یہ سنّاٹا ہوا کا یہ تھپیڑا موجِ طوفاں کا
نہیں معلوم اب جائے کدھر کشتی محبّت کی

(۱۷۲)

اُس کو بھی ڈھونڈھتے ہیں اپنی بھی جستجو ہے
اِک وہ بھی ہے تمنّا اِک یہ بھی آرزو ہے
جِس سے مہک رہا ہے باغِ جہاں وہ تُو ہے
پھولوں کو کون سونگھے اِن میں خودی کی بُو ہے
جِس دِل میں درد پایا اپنا اُسے بنایا
معشوق کی نظر میں عاشق کی آبرو ہے
ظاہر میں ہے خدا تُو باطن میں دِلرُبا تُو
یہ بھی ہے شان تیری، اِس شان میں بھی تُو ہے
عِصیاں پسند مجھ سا آمرزگار تجھ سا
دُنیا میں میں ہی میں ہوں، عقبیٰ میں تُو ہی تُو ہے
کیا کر دیا ہے جادو، آنکھوں میں بس گیا تُو

ہم جس کو دیکھتے ہیں تجھ سا ہی ہو بہو ہے
ہر پھر کے ڈھونڈھتا ہوں ہر سمت جستجو ہے
مل جائے تو کہیں سے بس تیری آرزو ہے

(۱۷۳)

تجکو دیکھیں تری دُنیا کا تماشا دیکھیں
دونوں آنکھوں میں نظر ایک ہے کیا کیا دیکھیں

ذرّے ذرّے سے عیاں جلوۂ یکتائی ہے
قطرے قطرے میں جو پنہاں ہے وہ دُنیا دیکھیں

اب کسی دوسرے عالم کا تماشا دیکھیں
دیدۂ شوق نہ جاتی ہوئی دُنیا دیکھیں

آنکھ پڑ جائے بتوں پر جو صنم خانے میں
جلوۂ حسن میں اک نُورِ خدا کا دیکھیں

دِل کو ضد ہے کہ نکل جاؤں گا پہلو سے ابھی
آنکھ کہتی ہے ذرا اور تماشا دیکھیں

آتشِ عشق میں دِل خاک ہوا جاتا ہے
گھر کسی کا جلے اور آپ تماشا دیکھیں

ہم سے اوروں سے زمانے میں سروکار نہیں
تُو دکھائے جو تماشا وہ تماشا دیکھیں

نامعلوم


نظم

جہاں میں ہوں

وہی حرص و ہوس کا تنگ زنداں ہے جہاں میں ہوں
وہی انساں وہی دُنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں
تمنّا قید، ہمّت پا بجولاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے جکڑے ہوئے زنجیرِ اِمکاں ہے جہاں میں ہوں
کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشکِ بیکس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں
کسی دن تپتے تپتے یہ بھی شاید سُرخ ہو جائے
ابھی پانی کا ایسا خونِ دہقاں ہے جہاں میں ہوں
اُفق پر ہوں تو ہوں دُھندلے سے کچھ جلوے مسرت کے
ابھی راحت فقط اک خوابِ ارماں ہے جہاں میں ہوں
کبھی شاید فرشتہ آدمِ خاکی بھی بن جائے
ابھی تو بھیس میں اِنساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں
غرض مندی کی پوجا عام ہے یوں ہر شوالے میں
محبّت اپنی فطرت پر پشیماں ہے جہاں میں ہوں

کبھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں
کسی دِن کوئی چنگاری نہ دُنیا کو جَلا ڈالے
جہاں خود اپنے شعلوں سے ہراساں ہے جہاں میں ہوں
غلاموں کی ہنسی ہی کیا بس اِک آوازِ بے نغمہ
بہارِ باغِ ہم رنگِ بیاباں ہے جہاں میں ہوں
نظر میں ہیں تصوّر کے وہی موہوم نظّارے
ابھی اِنساں حقیقت سے گُریزاں ہے جہاں میں ہوں
فقط ہلکی سی سطحِ آب پر ہے ایک جنبش سی
زبانوں پر فقط اِک ذکرِ طوفاں ہے جہاں میں ہوں
خدا وہ دِن تو لائے سُوز بھی اِک ساز بن جائے
ابھی ہر ساز میں اِک سُوز پنہاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوقِ آزادی ہے لیکن کیا کروں اِس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہیں جہاں میں ہوں
بدلنے کو بدل جائے جہاں لیکن ابھی مُلّاؔ
وہی دُنیائے برق و باد و باراں ہے جہاں میں ہوں

پنڈت آنند نرائن صاحب مُلّاؔ

دوشیزۂ صحرائی

(۱)

تو ہے سراپا نازنیں فطرت کی اک جلوہ گری
قیدِ تکلف سے بری
دنیائے غم سے بے خبر آزاد جنگل کی پری

(۲)

دنیا کی زیبائش ہے تو اے زینتِ دشتِ کہن
رنگینیٔ بزمِ سخن
نورِ سحر پر ہے ترے قرباں فلک کی انجمن

(۳)

گاتی ہے جب نغمے کبھی کھیتوں میں اپنے بیٹھ کر
مستی میں ہو کر بے خبر
اڑتی ہیں وہ تانیں تری موجِ ہوا کے ساز پر

(۴)

اپنے وطن سے دور ہے جنت کی شہزادی ہے تو
تصویرِ بربادی ہے تو
آغوشِ فطرت میں مگر صحرا کی آبادی ہے تو

(۵)

گدڑی میں لعلِ بے بہا غیرت دہِ شمس و قمر
پتوں میں گُل ہے جلوہ گر
شبنم ترے نظارے سے ہے آبدیدہ سر بسر

(۶)

تُو اِنتہائے حسن ہے اور عشق کا آغاز ہے
کیا ناز ہے انداز ہے
تو طائرِ تخیل کا گویا پرِ پرواز ہے

(۷)

گاگر لئے چلنا ترا اُف کیا قیامت خیز ہے
آفت ہے درد انگیز ہے
چلتے ہوئے رُکنا بھی یہ کچھ مصلحت آمیز ہے

(۸)

بھونرے کا دِق کرنا تجھے رَہ رَہ کے شرمانا ترا
ٹھوکر سے گر جانا ترا
گاگر کا گِر کر ٹوٹنا پھر اِس پہ گھبرانا ترا

(۹)

غصے میں بھر جانا ترا ہمجولیوں کو چھوڑنا
کنگن کنوَل کا توڑنا

پھولوں کی مالا پھینکنا گاگر کے ٹکڑے جوڑنا

(۱۰)

ٹکڑے یہ جُڑنے کے نہیں طاقت کوئی وہ اور تھی
جس سے تری گاگر بنی
ٹکڑوں میں جس سے تھی کشش شکتی وہ زائل ہو گئی

(۱۱)

ہستی کا یہ انجام ہے ہر شے کی ہے یہ کائنات
ہے نام فانی کا حیات
یوں دیکھنا زیبا نہیں انسان کو خوابِ ثبات

(۱۲)

جو پھول آتا ہے نظر کل دیکھنا اس کا مآل
ہو گا خزاں سے پائمال
کوئی کمال ایسا نہیں جس کو نہ ہو آخر زوال

(۱۳)

ٹکڑے ہوں تیرے جسم کے اک دن یونہی اے نازنیں
ہاں ہاں دلاتا ہوں یقیں
یہ مدّ بھری گاگر تری جوڑے سے جُڑنے کی نہیں

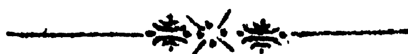
پنڈت اندرجیت شرما صاحب

میں اور تو

مرے شباب کی راتوں میں جلوہ گر ہے تو — تجھے شباب کی راتوں کا راز
شباب و حسن کی دنیا میں تجھ سے رونق ہے — شراب و شعر کی دنیا کا پاس
ملی ہے تجھ کو تو اوّل سے لذتِ ابدی — ازل کے روز سے مصروفِ انہ
تجھے طلسمِ جہاں کی حقیقتیں معلوم — مجھے تو اتنی خبر بھی نہیں ک
تو وہ چمن ہے کہ اُگتی ہے زندگی جس میں — اور آرزوے دلِ مرگِ ناگہا
ہے تیرا ذکر سرِ عرش و بر سرِ کعبہ — مرا یہ حال کہ گم کردۂ جہار
زمانہ کرتا ہے تجھ سے تو اکتسابِ سرور — جہاں میں باعثِ تکلیفِ د
ثبات تجھ کو جو حاصل ہے حسن و خوبی میں — تو اپنے مشربِ وحشت میں جاو

اگر تو میری محبت کا آئینہ ہے ندیم
ترے بہشتِ صداقت کی داستاں ہوں میں

حضرت اختر



پیتا ہوں

تعیّنات کی قیدیں اُٹھا کے پیتا ہوں
کلیم و طور کے قصّے بُھلا کے پیتا ہوں
حدیثِ دار و رسن گُنگنا کے پیتا ہوں

ہر ایک موج میں مے کی سما کے پیتا ہوں
شراب کو بھی شرابی بنا کے پیتا ہوں

کبھی میں اُن سے نگاہیں ملا کے پیتا تھا
تمام ہستیٔ دِل کو جگا کے پیتا تھا
مسرّتوں کے خزانے لُٹا کے پیتا تھا

اب آئینہ سے نگاہیں لڑا کے پیتا ہوں
تمام عالمِ امکاں پہ چھا کے پیتا ہوں

قسم قسم تری بہکی ہوئی نظر کی قسم
جو کھیلتی ہے ترے لب پہ اُس سحر کی قسم
رُکا ہوا ہے جو پلکوں پہ اُس گہر کی قسم

بدل بدل کے مزہ مُسکرا کے پیتا ہوں
حسیں لبوں کا تبسّم رلا کے پیتا ہوں

جنابِ شیخ و شریعت کو آنکھ دِکھلا کر
غمِ حیات کو موجوں میں مے کی نہلا کر
رگوں میں آتشِ نغمہ و شعر بھڑکا کر
زمیں کی سطح فلک سے مِلا کے پیتا ہوں
فلک کو اپنے قدم پر جُھکا کے پیتا ہوں

مری نظر میں ہیں آنکھوں کے اُنکی میخانے
سُنا رہا ہوں اُنھیں کو اُنھیں کے افسانے
چھلک رہے ہیں مری چشمِ تر کے پیمانے
اچھوتے نغمے نئی دُھن میں گا کے پیتا ہوں
نہ صرف پیتا ہوں بلکہ پِلا کے پیتا ہوں

شراب پیتا ہوں میں بھی بہت مگر اطاف
مری نگاہ نہیں کرتی میکدے کا طواف
مرا ہے دِل مئے سیّال کے بغیر ہی صاف
اِشارہ چشمِ مشیّت کا پا کے پیتا ہوں
کسی کو لُوٹ کے خود کو لُٹا کے پیتا ہوں

مری شراب کو کچھ حاجتِ سبو بھی نہیں
تری شراب کا سا اِس میں رنگ و بُو بھی نہیں
لبوں سے جام لگانے کی آرزو بھی نہیں
دوُرِ ناز میں سر کو جُھکا کے پیتا ہوں
جبینِ شوق میں کعبے بسا کے پیتا ہوں

ترے شباب نے یہ مے اگر نہیں چکھی
تو میں سمجھتا ہوں ناکامیاب ہے تُو بھی
ملی ہے اِس میں بھی کچھ کچھ گنُہ کی شیرینی

اِسے شراب میں اپنی ملا کے پیتا جا
ہر ایک قطرے کو دریا بنا کے پیتا جا

حضرت تاباں نقوی

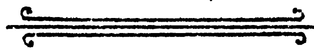
مسافر کا گیت

مسافر یوں ہی گیت گاتا چلا جا — یوں ہی جھومتا مسکراتا چلا جا
محبّت بھرے دِل کی تابانیوں سے — یہ ظلمتکدہ جگمگاتا چلا جا
ہٹا کر یہ دُنیا و ظلم و ستم کی — محبّت کی بستی بساتا چلا جا
نہ پہونچے جہاں دردمندوں کے نالے — وہاں شورِ محشر اُٹھاتا چلا جا
غریبی کے بازو میں جو قوّتیں ہیں — وہی قوّتیں آزماتا چلا جا
حوادث اگر راہ میں اُٹھ کھڑے ہوں — حوادث کی گردن جھُکاتا چلا جا
یہ مشکل تری ہو کے آساں رہے گی — ذرا صبر کر مسکراتا چلا جا
نہ کر فکر اِن پر، یہ ہلکی ہیں موجیں — سمندر میں طوفاں اُٹھاتا چلا جا
سما جائیں گی وسعتیں دو جہاں کی — ابھی دامنِ دل بڑھاتا چلا جا

بڑھاپے کی ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو — جوانی کا نغمہ سُناتا چلا جا
جفاؤں کا خرمن یہی پھونکتی ہیں — اِن آہوں کو شعلہ بناتا چلا جا
تڑپتی ہیں جو بجلیاں تیرے دل میں — اُنھیں بجلیوں کو گراتا چلا جا
پرِ شوق کو حکمِ پرواز دے کر — ستاروں سے نظریں لڑاتا چلا جا
وطن کے لئے جذبۂ زندگی کو — شہادت کی قسمیں دِلاتا چلا جا
رہِ سعیِ پیہم کی تاریکیوں میں — تمنا کی شمعیں جلاتا چلا جا

وطن کی رگوں کو لہو اپنا دے کر
فسانہ کو رنگیں بناتا چلا جا

چودھری پربھان شنکر صاحب بی اے آنرز



شکتی بان

میدانِ جنگ لنکا، آفت کا سامنا ہے — کُل فوج میں وفورِ رنج و غم و بکا ہے
زانو پر رام جی کے لچھمن نے سر رکھا ہے — دشمن کو بھی رُلا دے یہ حال رام کا ہے

بیٹھے ہوئے ہیں بیکل اور ہاتھ مل رہے ہیں
نظریں جھکی ہوئی ہیں، آنسو نکل رہے ہیں

لشکر پہ ہے تباہی، وحشت برس رہی ہے — ہے ہر طرف اُداسی شامت برس رہی ہے
پہنِ وغا میں گویا کلفت برس رہی ہے — چہرے سے رام جی کے حسرت برس رہی ہے

حدِ فزوں ہوا جب اندیشۂ جُدائی
دِل سے نکل کے تب یہ فریاد لب پہ آئی

لچھمن خلافِ عادت خاموش کیوں ہوئے تم — لب پر نہیں تمہارے اگلا سا وہ تبسّم
کیوں روٹھتے ہو بھائی مجھ پر کرو ترحّم — مختل ہے عقل میری، میرے حواس ہیں گم

تعمیلِ حکم میں کیوں تاخیر کر رہے ہو
تعظیم کرنے والے تحقیر کر رہے ہو

بستی سے ساتھ آئے جس طرح سُوئے صحرا — ساتھی بنوں گا یوں ہی ہستی سے میں عدم کا
جنگ و جدال ناحق بے سُود فکرِ دنیا — دشمن کو ہو مُبارک میں فتح کیا کروں گا

بھائی اگر نہیں ہے دُشوار زندگی ہے
بے لُطف زندگی ہے، بیکار زندگی ہے

ملکِ اودھ کو تنہا جب پھر کے جاؤں گا میں — اہلِ وطن کو اپنے کیا مُنہ دِکھاؤں گا میں
کیا بات شترگھن سے آخر بناؤں گا میں — پوچھیں گے لوگ مجھ سے جب کیا بتاؤں گا میں

لچھمن پہ چشمِ رحمت اے جسم و جاں کے مالک
سود و زیاں کے مالک امن و اماں کے مالک

کیا حسرتیں مٹیں ہیں کیا خوں ہوئے ہیں ارماں — یہ زندگی ہے میری یا دردِ غم کا طوفاں
اک جانِ زار اپنی غم کے ہزار ساماں — آوارگی۔ یتیمی۔ غربت۔ فراقِ جاناں

لچھمن تمہارے دم سے تھے لُطف زندگی کے
تم ساتھ چھوڑتے ہو، ہم کیا کرینگے جی کے

ہرگز نہ میں اکیلا سُوئے اودھ پھروں گا — اہلِ وطن کے طعنے ہرگز نہ میں سہونگا

یا اپنی زندگی میں جنگل میں کاٹ دوں گا
یا دشمنوں سے لڑ کر میں خود بھی مرمٹوں گا

بدنامیاں اُٹھائے دُنیا میں کون رہ کر
یہ فیصلہ ہے دل کا ذلّت سے موت بہتر

ماں باپ سے چھٹے تم، مُنہ بھائیوں سے موڑا
جنگل کی راہ پکڑی اپنے وطن کو چھوڑا

خاطر سے جسکی تم نے اپنوں سے رشتہ توڑا
دل کر رہے ہو بیٹھے کیوں آج اُس کا تھوڑا

مجکو بھی ساتھ لیلو گر خواہشِ سفر ہے
تنہا یہاں نہ چھوڑو یہ دشمنوں کا گھر ہے

حضرت رواںؔ اناؤدی

جہانگیری انصاف

ایک دن نورجہاں پہونچی محل پر جاکر
اور لگی دیکھنے جمنا کا سُہانا منظر

صبح کا وقت جو تھا ارض و سما پر طاری
تازہ دم ہو کے فضا کھیل رہی تھی یکسر

مچھلیاں بھی پئے تفریح وہیں دریا میں
اُٹھ کے پانی سے اچھلتی تھیں ادھر اور اُدھر

دیکھتے ہی یہ سماں نورجہاں نے سوچا
آزمایش ہو نشانے کی کچھ اس موقعے پر

لے لیا ہاتھ میں پھر اس نے طپنچہ فوراً
ایک مچھلی پہ اسی وقت پڑی جاکے نظر

اور اُسی وقت طپنچے کی کڑک سے ہر سُو
ایک لمحے کو ہوا سب وہ سماں زیر و زبر

لیکن افسوس کہ چاہی ہوئی مچھلی کے بجائے
ایک دھوبی پہ پڑا جاکے نشانے کا اثر

جان سے اپنی ہی وہ ہاتھ غرض دھو بیٹھا — پارچہ دھونے کو پانی میں گیا تھا جو اُتر

صدمۂ غم سے یکایک تڑپ اُٹھی دھوبن — پہونچی دربارِ شہی میں وہ ملول و مضطر

کی شہنشاہ جہانگیر سے جا کر فریاد — اور رُو رُو کے کہا حالِ وفاتِ شوہر

اِسقدر رنجِ رعیت سے ہوا دِل کو الم — خود شہنشاہ کی آنکھوں میں بھی اشک آئے بھر

یہ ہوا حال مگر دیکھتے ہی دیکھتے پھر — آگیا چہرۂ عالی پہ معاً رنگِ دگر

ہو کے سنجیدہ وہیں اُس نے طپنچہ اپنا — رکھ دیا ہاتھ پہ دھوبن کے بلا خوف و خطر

ساتھ ہی سینہ سپر ہو کے ہوا اُستادہ — اور یہ الفاظ ہوئے اُسکے دہن سے باہر

"اِس طپنچے سے مجھے جلد ہی کر تو بھی ہلاک — تا کہ ہو جائے اب اِس طرح مداوائے ضرر"

"کیونکہ انصاف کا بے شبہ تقاضا ہے یہی — بیوگی ہی میں ہو بیگم کی بھی اب عمر بسر"

سُن کے اُسوقت جہانگیر کے مُنہ سے یہ بات — جو بھی موجود تھے دربار میں سب تھے ششدر

اور اُن سب سے بُرا حال تھا فریادی کا — یعنی دھوبن بھی کھڑی کانپ رہی تھی تھر تھر

آخرش اُس نے طپنچے کو پٹک کر اُس جا — یوں کہا ڈال کے قدموں پہ جہانگیر کے سر

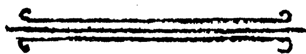
"ہے شہنشاہ کا ارشاد بجا اور درست — ایسے انصاف کی تو چاہ نہیں مجکو مگر"

"جس سے یک گونہ رعیت ہی کی حالت ہو جائے — بیوگی کی بھی زبونی سے زیادہ ابتر"

"بس یہ بہتر کہ اب اِس حال میں جو کچھ گذرے — پڑ کے مجھ ایک ہی بیوہ پہ وہ سب جائے گذر"

سحرؔ البتہ شہنشاہ کی فیاضی سے
اپنے گھر لے کے گئی سیم و زر و لعل و گہر

حضرت سحرؔ ہنگامی



میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب سنّاٹا چھا جاتا ہے اور رات اندھیری ہوتی ہے
جب مدہوشی کے زانو پر خلقت سر رکھ کر سوتی ہے
جب کالے کالے بادل گھر کر دُنیا پر چھا جاتے ہیں
اور اپنے خوش کُن نغموں سے پیغامِ عیش سُناتے ہیں
جب کالی گھٹائیں کوند کوند کر برقِ تبسّم کرتی ہے
یا سیندور سے لیلیٰ شب کی مانگ کو قدرت بھرتی ہے
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب سرد ہوائیں چلتی ہیں اور بادِ صبا اِٹھلاتی ہے
جب پھولوں کی دِلکش بُو سے معمُور فضا ہو جاتی ہے
جب چڑیاں اُڑتی پھرتی ہیں، جب کوئل شور مچاتی ہے
جب پتّی پتّی ہِل ہِل کر افسانۂ عشق سُناتی ہے
جب ندی نالے بڑھتے ہیں پُر کیف صدائیں آتی ہیں
جب ننھی منّھی کلیاں کِھل کر گیت رسیلے گاتی ہیں
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب نُور کا تڑکا ہوتا ہے جب صبح گلابی ہوتی ہے
گلہائے چمن کا شبنم سے جب بادِ صبا مُنہ دھوتی ہے

دِن بھر کی منزل طے کر کے جب مہر یہیں سو جاتا ہے
اور اپنی حد سے آگے بڑھ کر سُرخی میں کھو جاتا ہے
یا چاند رو پہلی پوشش میں جب بامِ فلک پر آتا ہے
جب ننھّے ننھّے تاروں کا اک حلقہ سا بن جاتا ہے
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

پی کہکے پپیہا ظالم جب ہجوروں کو تڑپاتا ہے
جب بِرہ کی ماری دُکھیوں کے سینے میں آگ لگاتا ہے
جب بُلبُل ہجر میں مُضطر ہو کر خون کے آنسو روتے ہیں
جب شمع کی گود میں سر رکھکر پروانے بیخود ہوتے ہیں
جب دِل کو صدمے ہوتے ہیں جب جان پہ رنج گزرتے ہیں
جب بیچینی کے عالم میں دِل کے جذبات اُبھرتے ہیں
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب مجمع سا لگ جاتا ہے کچھ چنچل شوخ حسینوں کا
جب جلوہ خود کھنچ آتا ہے آنکھوں میں ماہ جبینوں کا
جب ہوش ٹھکانے ہوتے ہیں کچھ صبر و سکوں ملجاتا ہے
جب اُنکے جنبشِ دامن سے دِل کا غنچہ کھل جاتا ہے
جب جلوہ دِکھاتا ہے کوئی ساقی بن کر میخانے میں
جب مست نگاہیں بھرتی ہیں گلگوں صہبا پیمانے میں
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

صدموں پر صدمے پڑتے ہیں جب دُکھ کا غلبہ ہوتا ہے
جب ضیق میں جان آجاتی ہے دِل خون کے آنسو روتا ہے
جب جینے سے اُکتاتا ہوں اور موت کی خواہش کرتا ہوں
جب اپنے دِل کے ساغر میں خود رنگ فنا کا بھرتا ہوں
جب رنج و مصائب میں گھِر کر میرے دن رات گزرتے ہیں
بادل طوفانی اُٹھ اُٹھ کر جب خون کی بارش کرتے ہیں
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمہاری کرتا ہوں
جب اشکِ ندامت ٹپک ٹپک کر داغِ معاصی دھوتے ہیں
جب دِل کے ذرّے ذرّے میں پاکیزہ جذبے ہوتے ہیں
جب حسرت خود مُنہ تکتی ہے دِل کی معصوم اُمنگوں کا
کچھ نا معلوم اُمنگوں کا یا کچھ معلوم اُمنگوں کا
آہنگِ سازِ ازل سے جب مسرور مرا دِل ہوتا ہے
خود میری عبودیت کا نغمہ جب زیست کا حاصل ہوتا ہے
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمہاری کرتا ہوں
خورشید جب اپنے جلوؤں کا نیرنگ دِکھا کر جاتا ہے
جب خونِ شفق کی لالی سے دامانِ فلک بھر جاتا ہے
جب جوشش کے عالم میں دِل پر وحشت سی طاری ہوتی ہے
جب دُنیا پر میں ہنستا ہوں اور دُنیا مجھ پر روتی ہے

جب عشق کی منزل سے بڑھکر میں خود میں گم ہو جاتا ہوں
جب اِس دُنیا میں رہ کر بھی اُس دُنیا میں کھو جاتا ہوں
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمہاری کرتا ہوں

حضرت کیلاش ورما شائق ہنگامی



میں

خزاں نے روند دیا جسکو وہ بہار ہوں میں
اُجڑ گیا ہے سنور کر جو وہ سنگار ہوں میں
اُتر گیا تری ترشی سے جو خمار ہوں میں
گراں زمیں کو جو معلوم ہو وہ بار ہوں میں
قدم قدم پہ گماں ہو رہا ہے منزل کا
ہر ایک موج پہ دھوکا مجھے ہے ساحل کا
ہر ایک پردہ سمجھتا ہوں پردہ محمل کا
فریبِ حسن میں اُلجھی نظر کا تار ہوں میں

خیال و خواب کی دُنیا بسائی ہے میں نے
ہر امید و یاس کی دولت کمائی ہے میں نے
خلش جگر میں تپش دل میں پائی ہے میں نے
کسی کے وعدۂ باطل کا انتظار ہوں میں

اُمید و یاس کی پیچیدگی میں اُلجھا ہوں
خیالِ سود و زیاں کا شکار بیٹھا ہوں
عجیب حال ہے مرتا ہوں میں نہ جیتا ہوں
قرار جسکو نہ آئے وہ بیقرار ہوں میں

مری طرف بھی نگاہِ کرم اُٹھا ساقی
مری وفاؤں کا کچھ تو ملے صلا ساقی
نہ مے ہو ڈھونڈھ کے تلچھٹ ہی لا پلا ساقی
شفق ہے نام بہت کہنہ بادہ خوار ہوں میں

یاد

اجل وقتِ نزع جبکہ ہمارے رُو برُو ہوگی
تمہارا دھیان ہوگا اور تمہاری جستجو ہوگی
نگاہِ شوق حسرت سے بھٹکتی چارسُو ہوگی
دلِ بیتاب میں بس اِک یہی اک آرزو ہوگی
زباں پر نام تیرا اور تیری گفتگو ہوگی

رواں آنکھوں سے اِسکے بعد بھی خونِ جگر ہوگا
سوا تیرے ہر اک شے سے مرا دل بے خبر ہوگا
چھٹے گی نبض اور سکتے میں بیٹھا چارہ گر ہوگا
نظر آئیگا کوئی بھی نہ۔ میرے پاس گر ہوگا
تری دُھندلی سی بس تصویر میرے رُوبرُو ہوگی

اُسی تصویر سے کچھ گفتگو شکوہ نُما ہوگی
وہی راہِ عدم میں ہمسفر اور رہنما ہوگی
خدا جانے پھر اسکے بعد حالت کیا سے کیا ہوگی
اگر افشا تیری تصویر سے بوئے وفا ہوگی
تو روزِ حشر تک ملنے کی تجھ سے آرزو ہوگی

عزیز واقربا مشغول تابوت وکفن ہوں گے
ہمارے گرد نالہ ہائے بس رنج ومحن ہوں گے
سجے گی میری میت اور ہم شکلِ دُلہن ہوں گے
مگر اُسوقت بھی ہم یاد میں تیری مگن ہوں گے
ہمیں تو حشر کے دن تک تمہاری جستجو ہوگی

سُلا کر قبر میں سب دھیرے دھیرے بھول جائینگے
جنھیں کچھ اُنسیت زیادہ ہوئی تُربت پہ آئینگے

پڑھیں گے فاتحہ اور شمعِ کافوری جلائیں گے   چڑھا کر چادرِ گُل عطر کا پھایا لگائیں گے
عبث ہے سب نہ گر زلفِ دوتا کی مُشکبو ہو گی

آرزو

خبر پا کر میں مرتا ہوں نہ تم خاموش ہو جانا
نہ یوں محسوس ہی کرنا کہ خود بیہوش ہو جانا
دمِ آخر تو اک بار ہم آغوش ہو جانا
پھر اس کے بعد تم چاہے جہاں رُوپوش ہو جانا
تو محشر تک نہ پھر ملنے کی تم سے آرزو ہو گی

نشاط و عیش کے جھگڑوں میں تم پھنس کر نہ رہ جانا
سُنائیں غیر گر طعنے بھی تو اِک بار سہ جانا
اگر ہاں خوفِ رُسوائی تمھیں خود ہو تو رہ جانا
سبب تُربت پہ لیکن پھر کسی دن آ کے کہہ جانا
ندامت ورنہ محشر میں کسی کے رُوبرُو ہو گی

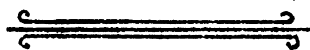
ہمارے غمگساروں میں ہو۔ یوں صُورت دکھا جانا
نہ چلنا ساتھ میت کے فقط کاندھا لگا جانا

اگر دِقّت طلب ہے آپ کا گھر تک بھی آجانا
جنازہ در سے جب گزرے تو تم در پر ہی آجانا

یہی اُلجھن لحد میں ورنہ میرے رُوبرُو ہوگی
لحد پر ایک شمع ہوگی لیکن وہ بجھی ہوگی
گلِ پژمُردہ کی شاید ہے اِک چادر بچھی ہوگی
بجائے عطر کے بُوئے دفا بس آرہی ہوگی
یہ ساماں ہوں نہ ہوں ردئی مگر ہاں بیکسی ہوگی
زبانِ خشتِ مرقد پر تمہاری گفتگو ہوگی

رحم آجائے حالت دیکھ کر آنسو بہادینا
چڑھانا چادرِ گلُ اور اِک شمع جلا دینا
خفا ہونا، خرامِ ناز سے ٹھوکر لگا دینا
بہر صورت مری مٹّی کنارے سے لگا دینا
پسِ مُردن لحد میں بس یہی اِک آرزو ہوگی

حضرت شفق کانپوری



بُلبُلہ

پھُولا ہوا ہے کس لئے؟ کیا بُلبُلے میں ہے   اللہ کون سی یہ ہوا بُلبُلے میں ہے

اُف کسقدر غرور بھرا بلبلے میں ہے　　فرعون کوئی آکے چھپا بلبلے میں ہے
کتنا اُبھار، کتنی اکڑ، کیسی شان ہے
پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے

ہے آب و تاب خوب مگر یہ گہر نہیں　　ہے تاج یہ کسی کا مگر زیبِ سر نہیں
گنبد عجیب سا ہے مگر کوئی در نہیں　　سر بن ہوا ہے اس کے مگر یہ بشر نہیں
دم خم کے ساتھ بھی نہیں تلوار بلبلہ
پھر چیز کیا ہے اے اولوالابصار بلبلہ

یارب کسی کا آبلۂ پا ہے بلبلہ　　یا دل جلوں کے دل کا پھپھولا ہے بلبلہ
فوراً نہاں نظر سے جو ہوتا ہے بلبلہ　　مجھکو یقیں ہے بیضۂ عنقا ہے بلبلہ
یہ بلبلہ ہے یا کہ طلسمِ حیات ہے
پیدا ہوا ابھی، ابھی نذرِ ممات ہے

محروم اس کو چشمِ بصیرت سے دیکھئے　　اپنی نگاہِ عاشقِ قدرت سے دیکھئے
کچھ سوچئے جناب نہ حیرت سے دیکھئے　　ہر ایک شئے کو دیدۂ عبرت سے دیکھئے
جویا ہے کُنہ رازِ نہاں کے لئے یہاں
عالم کا ذرہ ذرہ ہے اسرار کا جہاں

ہے وقتِ موج آبِ رواں اور یہ بشر　　ہے بلبلہ کہ اپنی فنا سے ہے بے خبر
آجائے ایک موجۂ بادِ فنا اگر　　رہ جائے بلبلہ کی طرح دم میں ٹوٹ کر
کرتا ہے بلبلہ سبق آموزیِ فنا
دیتا ہے آدمی کی حقیقت کا یہ پتا

تلوک چند صاحب محروم

بہتا ہوا پانی

بہتا ہوا یہ دریا اِک نغمہ ہے ہستی کا
پانی کا ہر اِک قطرہ اِک ساز ہے مستی کا
کیا نغمہ سرائی ہے
کیا ہوش رُبائی ہے

اِک ساز سا بجتا ہے دریا کی روانی میں
اِک راگ سا پیدا ہے بہتے ہوئے پانی میں
دل جس سے بہلتا ہے
جو درد ہے ٹلتا ہے

ہستی کے گلُستاں کی جو چیز ہے فانی ہے
اور زندگی اِنساں کی بہتا ہوا پانی ہے
چلنے میں اٹک جائے
دم بھر میں بھٹک جائے

اِس دہر کی بستی سے ہے دُور مکاں میرا
اِس دہر کی پستی سے اونچا ہے گماں میرا
میں اس میں رہوں کیونکر
دُکھ درد سہوں کیونکر

اے بہتے ہوئے پانی ۔ تو مجھکو بہائے جا
اے قطرۂ یزدانی ۔ وہ راگ سُنائے جا
سُن کر جسے سو جاؤں
خاموش میں ہو جاؤں

پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ صاحب ناشاد

پھولوں کی ڈالی

بُلبُل کا چُرایا دل ناحق، یہ خام خیالی پھولوں کی
لیتی ہے تلاشی بادِ صبا اب ڈالی ڈالی پھولوں کی
عالم ہے انوکھا کلیوں کا، دُنیا ہے نرالی پھولوں کی
اللہ ری اِس خوش حالی پر یہ خوش اقبالی پھولوں کی
مانا کہ لُٹایا راتوں کو گلزار میں موتی شبنم نے
جب صبح ہوئی، سورج نکلا تو جیب تھی خالی پھولوں کی
گُلچیں کی بھی نظریں پڑتی ہیں صرصر کے بھی جھونکے آتے ہیں
ہوا ایسے میں کس سے کیونکر کب تک رکھوالی پھولوں کی
آتی ہے خزاں اب رُخصت کر، زندہ جو رہے پھر آئیں گے
ہم سے تو نہ دیکھی جائے گی مالی! پامالی پھولوں کی

گلزارِ جہاں کو جب دیکھا تو شکل نظر آئی مجکو
عالم سے الگ عالم سے جُدا عالم ہے نرالی پھولوں کی

پھر رُت بدلا، پھر ابر اُٹھا، پھر سرد ہوائیں چلنے لگیں
ہو جائے پری، بن جائے دُلہن، اب ڈالی ڈالی پھولوں کی

ہاروں میں گندھے، جکڑے بھی گئے، گلشن بھی چھٹا، سینہ بھی چھیدا
پہنچے مگر اُنکی گردن تک یہ خوش اقبالی پھولوں کی

بُلبُل کو یہ سمجھا دے کوئی کیوں خون کے آنسو روتی ہے
اُڑ جائے گی سُرخی پھولوں سے مِٹ جائیگی لالی پھولوں کی

ہم اپنے دِل میں داغوں کو یوں دیکھتے ہیں یوں جانچتے ہیں
کرتا ہے نگہبانی جیسے گلزار میں مالی پھولوں کی

جو لطف کبھی حاصل تھا ہمیں وہ لُطف چمن کے ساتھ گیا
اب کُنجِ قفس میں کھینچتے ہیں تصویر خیالی پھولوں کی

اے بادِ صبا، مرغانِ چمن دیتے ہیں تجھے یہ دل سے دُعا
اللہ کرے خوش وہ بھی رہے، خوش رکھنے والی پھولوں کی

صیاد کے گھر سے گلشن تک اللہ ہی پہونچائے مجکو
اُمید نہیں، میں خوش ہو کر دیکھوں خوش حالی پھولوں کی

ہر مصرع میں، ہر شعر میں ہے گلہائے مضامیں کا جلوہ
اے نوح کہوں میں اسکو غزل یا سمجھوں ڈالی پھولوں کی

حضرت نوح ناروی

رُباعیات

خوں کے ساغر انڈیلتا ہوں میں — درد اور ٹیس جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں — اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

زندگی کیوں نڈھال کرتے ہو — روح کو پائمال کرتے ہو
آدمی اور گناہ سے پرہیز — تم بھی اختر کمال کرتے ہو

حضرت اختر

کب شیشہ لیا جام لیا ساقی نے — آنکھوں سے فقط کام لیا ساقی نے
بے مئے پئے جب قدم میں لغزش آئی — تو ہنس کے مجھے تھام لیا ساقی نے

حضرت کشتہ

حرص و ہوس حیات فانی نہ گئی — اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگ مزار پہ ترا نام رواں — مر کر بھی امید زندگانی نہ گئی

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے — دل بے پروا ہے امیری یہ ہے
زنجیر نہیں باعث قید رواں — محدود ہے خیال اسیری یہ ہے



افسانۂ زندگی سُنانا ہے تمھیں ٹوٹا ہوا دل ذرا دکھانا ہے تمھیں
پھر کیا آئے جو جان تن میں نہ رہی جلدی آؤ اگر اب آنا ہے تمھیں

کِس کی تنویر روحِ انسانی ہے کِس کا جلوہ یہ بزمِ نُورانی ہے
یہ ماہِ دو ہفتہ اور یہ مطلعِ صبح کِس کا رُخسار کِسکی پیشانی ہے

ملنا کِس کام کا اگر دِل نہ ملے چلنا بیکار ہے جو منزِل نہ ملے
وسطِ دریا میں غرق ہونا اچھا اِس سے کہ نظر میں آکے ساحل نہ ملے

آنسو ہنستے ہیں ہچکی ہنستی ہے تارے ہنستے ہیں چاندنی ہنستی ہے
دُنیا ہنستی ہے بندگی پر میری اور مُجھ پہ جبیں بندگی ہنستی ہے

انجام کی فکر ہو شریعت یہ ہے جان صرفِ وفا رہے ریاضت یہ ہے
زاہد سے کہو نماز روزہ بے سود دل خوفِ خدا کرے عبادت یہ ہے

جتنا بہوش تر ہوں دانا تر ہوں جتنا مشہور تر ہوں رُسوا تر ہوں
اے میرے مٹانے والے معلوم نہیں میں ہستی و نیستی سے بالا تر ہوں

راز قدرت کسی کو معلوم نہیں
اُسکی نیت کسی کو معلوم نہیں
سب محو ہیں آج کے مشاغل ہیں یاں
کل کی حالت کسی کو معلوم نہیں

آنسو ہنستے ہیں یہ ہنسی کیسی ہے
ظالم دُنیا کی دوستی کیسی ہے
سب ہیں اور دل کا کوئی ہمدرد نہیں
اللہ یہ میری بیکسی کیسی ہے

میں خود غرض حیات مستانہ ہوں
یعنی کہ مُطیع حکم جانانہ ہوں
دو رُخ ہر حال ہیں باہم ہستی کے میری
سب میں شامل ہوں سب سے بیگانہ ہوں

اپنے ساقی سے کل یہ پوچھا میں نے
کتنے میخوار تشنہ لب آتے ہیں
بولا کہ مقدرات ہیں بادہ وظرف
آنیکی اگر کہو تو سب آتے ہیں

حضرت رواں اناوی

تلقین ضمیر پر اُبھرنا سیکھو
اپنے جوہر کی قدر کرنا سیکھو
دُنیا ہے مقام امتحان ہستی
جینا منظور ہو تو مرنا سیکھو

اپنی قیمت گہر کو معلوم نہیں
قدر سایہ شجر کو معلوم نہیں
سجدہ کرنیکو ہیں فرشتے تیار
اپنی عظمت بشر کو معلوم نہیں

آنکھیں مخمورِ نگار کر دے ساقی | اِن میں کیفِ بہار بھر دے ساقی
میرے جذباتِ عشق بے معنی کو | زینت دہِ حُسنِ یار کر دے ساقی

حضرت گنگا دھر ناتھ صاحب فرحت

قطعہ

شرابِ ارغوانی چاہتا ہوں | میں اک رنگین جوانی چاہتا ہوں
جو پھر جائے غمِ دُنیا و دیں پر | مرے ساقی وہ پانی چاہتا ہوں

بے صدق سعی سے کیا نتیجہ نکلا | جب شُکر کیا شکوۂ بیجا نکلا
جو آہ بھری بادِ مخالف ٹھہری | جو نالہ کیا صدا بصحرا نکلا

حضرت اسعد شاہجہانپوری

سونے کے لئے نرم بچھونے دیکر | منظر کچھ سانولے سلونے دیکر
معصوم سمجھ کے مجھکو اس دُنیا میں | بہلا دیا دو چار کھلونے دیکر

ہنس رہا ہوں نہ رو رہا ہوں میں | بزمِ ہستی میں سو رہا ہوں میں
دِن گزرتا ہے رات جاتی ہے | دولتِ عُمر کھو رہا ہوں میں

نامعلوم

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیا تھی　　بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گُل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا　　اِک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

مضطر آیا ہوں بیقرار آیا ہوں　　اپنی ہی نظر میں ہو کے خوار آیا ہوں
بخشش نہ دیکھوں کیسے رحمت تیری　　ہشیار کہ میں گنہگار آیا ہوں

نوروز ہے غرقِ بادۂ دُنیا کردے　　میرا ارمان آج پورا کر دے
پی لوں میں شراب بھر کے اتنی ساقی　　تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کر دے

اس دارِ فنا میں مقصدِ دل کیا ہے　　کہئے تعبیر خواب باطل کیا ہے
جب قلب کو اک دم بھی راحت نہ ملی　　آخر اس زندگی کا حاصل کیا ہے

وہ لذّتِ شورشِ نہانی نہ رہی　　ہر وقت اپنے سے بدگمانی نہ رہی
جینا ہی نہیں نام سانس لینے کا رواں　　کیا لطفِ حیات۔ جب جوانی نہ رہی

محفوظ ستم اگر یہ چھالا ہوتا　　دِل کا انداز ہی نرالا ہوتا
دیکھو دیکھو کہاں رکھتے دیتے ہو پاؤں　　تم نے آئینہ توڑ ڈالا ہوتا

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اِس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواںؔ
یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

ہے چشمِ حواس کور - آفت یہ ہے
ہم راہِ رَوَاں کو رنجِ غربت یہ ہے
آتے ہیں کہاں سے؟ اور جانا ہے کہاں
اس کی بھی خبر نہیں مصیبت یہ ہے

فانی ہے جہاں یہ کچھ عجب بات نہیں
پابندِ بقا کسی کے اوقات نہیں
کہتے ہیں یہ آدمی کے اطوار رواںؔ
اعمال دلیلِ اعتقادات نہیں

امکانِ عمل کی دستگیری کے نثار
اے روحِ رواں تیری فقیری کے نثار
زنجیر ہے اور پاؤں غائب ہیں رواںؔ
اس آزادی کے اِس اسیری کے نثار

مذہب فقط اِک ہوس ہے ایمان نہیں
بابِ ایمان کا کوئی عُنوان نہیں
نیکی کرنا تو خیر مشکل ہے رواںؔ
بندہ کے لئے گُنہ بھی آسان نہیں

جب نفس پہ فتحیاب ہو جاتا ہے
اِنسان عظمت مآب ہو جاتا ہے
اُف عشق کے سوزشِ دروں کی تاثیر
ہر داغِ دل آفتاب ہو جاتا ہے

کل صبح نے مسکرا کے تاروں سے کہا
ہو جائیں گے اب تمہارے انوار فنا
تاروں نے کہا کہ ہم رہیں گے یوں ہی
تو آئیگی اور ختم ہو جائیگی۔ آ

ساقی وہی جام و بادہ و مینا۔ لا
اپنے ہاتھوں سے ساغرِ صہبا لا
کیسا دوزخ کہاں کی جنت۔ ساقی
پلٹا ابتک نہ کوئی جانے والا

عزت اچھی نہ مال و دولت اچھی
حاصل جس سے ہو دل کو راحت اچھی
جس سے اصلاح نفس ناممکن ہو
اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

مایوس دلوں کا مدعا دے ساقی
شمع مردہ کو پھر جلا دے ساقی
پھر دل کے عقیدے ڈگمگاتے ہیں رواں
چہرہ سے نقاب پھر اٹھا دے ساقی

جب چشم ہوائے شوق ہو جاتی ہے
بیدار سی جیسے روح ہو جاتی ہے
اس طرح ترے خیال میں گم ہوں
مچھلی پانی میں جیسے کھو جاتی ہے

جب شب میں شعاع نور کھو جاتی ہے
بیدار روح سکوت ہو جاتی ہے
فطرت اسوقت گنگناتی ہے رواں
جس دم دنیا تمام سو جاتی ہے

حضرت رواں اناوی

دیکھو سیلابِ زندگانی دیکھو
بہتے ہوئے بحر کا بھی پانی دیکھو
دو موجیں جنکے موت و زندگانی ہیں نام
دونوں کی ملی ہوئی روانی دیکھو

دریا میں حباب کی صفائی دیکھی
خوب آب و ہوا کی آشنائی دیکھی
ہاں! ہاں! تھا ابھی یہیں، ابھی ہے غائب
دیکھی؟ ہستی کی بیوفائی دیکھی؟

اعمال کی راہ سے گزر لیتا ہوں
ہر روز نئے گناہ کر لیتا ہوں
"ہے موت کا ایک دن معین" لیکن
ہر روز نئی موت سے مر لیتا ہوں

رسوا آیا ہوں خوار آیا ہوں
درگاہ میں تیری شرمسار آیا ہوں
اپنی رحمت کی لاج رکھ لے مالک!
ہر چند کہ میں گناہگار آیا ہوں

اعمال سے اپنے ڈر نہیں سکتا ہوں
مرنا چاہوں تو مر نہیں سکتا ہوں
تادیبِ ضمیر سے ہوں فرحت مجبور
چاہوں تو گناہ کر نہیں سکتا ہوں

اول نہ مٹا تو نقشِ ثانی نہ مٹا
مرنے سے بھی داغِ زندگانی نہ مٹا
ہر چند ہے ٹوٹی ہوئی زنجیرِ حیات
امکانِ حیاتِ جاودانی نہ مٹا

نادیدہ خدا، خدا پرستی کیسی
ہے بے پیئے جام کی یہ مستی کیسی
مذہب سے ہوئی نہ جستجو کی سیری
فرحتؔ شوقی ہے یہ بھی بستی کیسی

کوثر کی ہوس سے مے پرستی اچھی
اُمیدِ نعم سے فاقہ مستی اچھی
گر وصل نہ ہو تو ہجر سے بہتر موت
نادیدہ خدا سے خود پرستی اچھی

دل کو مستِ نگاہ کردے ساقی
کردے ہاں! ہاں! تباہ کردے ساقی
میری بخشش کو خود ہی رحمت دوڑے
اِتنا غرقِ گناہ کردے ساقی

کوثر کی شراب مجھکو ملنے سے رہی
اُمید کی یہ کلی بھی کھلنے سے رہی
دوزخ ہی میں کیوں نہ کرلوں مخصوص مکان
جنت میں جگہ تو مجھکو ملنے سے رہی

حوریں ہونگی تو چیرہ دستی ہوگی
غلماں ہونگے تو بادہ مستی ہوگی
فرحتؔ یہ حقیقت بھی ہے ناگفتہ بہ
جنت میں عجب ہوس پرستی ہوگی

حوروں سے بہشت میں محبت ہوگی
پھر جوشِ محبت میں رقابت ہوگی
جنت بھی عجب رزم گہِ اُلفت ہے
فرحتؔ صاحب وہاں بھی آفت ہوگی

ہر روز ہمہ وقت غٹا غٹ پینا — بادہ جو میسّر نہ ہو تلچھٹ پینا
مشرب ہے یہی، شغل یہی رندوں کا — پیسے نہ میسّر ہوں تو پھوکٹ پینا

بہتان کہ بے دام و درم پیتا ہوں — وہسکی نہ میسّر ہو تو رم پیتا ہوں
ٹھہرے کا مری بزم میں ہی ذکر فضول — زیادہ نہ میسّر ہو تو کم پیتا ہوں

بے کیف ہے بے کیف ہے پینا ساقی — بے سود ہے بے سود ہے جینا ساقی
جب تو ہی نہیں تو بس ہی پھیکا فرحتؔ — چھایا ہو اساون کا مہینا ساقی

جنّت کی ہوس نہ ہی اُمیّدِ جنّت — قسمت ہی نہیں ہے عیدِ دیدِ جنّت
اے شیخ اجارہ دارِ جنّت! سچ کہہ — کس سے ہے ملی تجھے کلیدِ جنّت

کس کام کا یہ وعظ، یہ تلقین اے شیخ! — جب دل ہی کو ہوتی نہیں تسکین ای شیخ!
عقبیٰ کی خبر تجھے، نہ مجکو فرحتؔ — گو طرزِ بیاں ترا ہے رنگین اے شیخ!

حضرت گنگا دھر ناتھ صاحب فرحتؔ کانپوری

آزادیٔ دُنیا سے اسیری بہتر — سرکش جو شباب ہو تو پیری بہتر
بندوں میں خودی کی شان آجاتی ہے — واللہ امیری سے فقیری بہتر

رنگ ہم نے زمانہ کا نکھرتے دیکھا
چڑھتے ہوئے دریا کو اُترتے دیکھا
کم ظرفوں میں کچھ ظرف نہیں ہوتا ہے
دم بھر ہی حبابوں کو ابھرتے دیکھا

بے رنگ بھی ہوں اور رنگیلا بھی ہوں
گُل پھول نہیں ہوں کانٹو نہیں کانٹا بھی ہوں
برتی ہیں دو رنگیاں زمانہ کی بہت
فارق میں برا بھی ہوں اور اچھا بھی ہوں

گلزارِ معانی میں چہکتا ہوں میں
بُلبُل کی بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہوں میں
کانٹوں سے کہیں رُکتی ہے نکہت فارق
وہ پھول ہوں ہر وقت مہکتا ہوں میں

زندوں کی رہی ہے زندگانی باقی
مُردوں کی نہیں کوئی نشانی باقی
فارق مجھے پیری نے دبا رکھا ہے
لیکن ہے کلام میں جوانی باقی

ہر ایک کو صاف دل سمجھتا ہوں میں
جو ملتے نہیں اُن سے بھی ملتا ہوں میں
لیکن صفتِ مے کشیدہ فارق
جب مجکو جلاتے ہیں تو کھنچتا ہوں میں

دِل باقی ہے اپنا نہ جوانی باقی
البتہ ہے اِک رام کہانی باقی
اب آئیں مضامین کہاں سے فارق
طبع ہے نہ طبع میں روانی باقی

رُخ کبھی آبلوں کا خار جو پا لیتے ہیں — داستاں تشنہ دہانی کی سُنا لیتے ہیں
آبلہ کوئی اگر پھُوٹ کے رُو دیتا ہے — اِتنا ہو جاتا ہے کچھ پیاس بجھا لیتے ہیں

ممکن جو ہوا نگاہبانی کر لی — خود موت کی نذر زندگانی کر لی
ہم کھیل سمجھتے رہے ابتک فارِق — پیری نے تو قبضہ میں جوانی کر لی

حضرت فارِق متھرا

قطعہ

رات کی وہ بزمِ عشرت گدگداتی ہے مجھے — تجھ سے اے مجہولِ تقوی شرم آتی ہے مجھے
ہائے وہ رِطلِ گراں ساقی کے نازک ہاتھ پہ — میں سمجھا تھا کہ رحمت آزماتی ہے مجھے

بادِ سحری سے آہ بھرنا سیکھو — دریا کے حُباب سے اُبھرنا سیکھو
مرنے کا ہے ڈر تو کامیابی ہے محال — جینے کی ہے آرزو تو مرنا سیکھو

میخانہ ہے وقف بادہ نوشوں کیلئے — اور کُنجِ حرم ہے خرقہ پوشوں کیلئے
وہ خلوت راز جسکی مشکل ہے مثال — مخصوص ہے ہم سے خود فروشوں کیلئے

اے مرغِ سحر خیز! تکلم کا ہے وقت — اے غنچۂ خوابیدہ تبسم کا ہے وقت
اے ساقی جہاں نواز ساغر صہبا — یہ روح و خمار کے تصادم کا ہے وقت

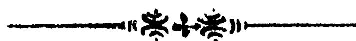
حضرت اسعد شاہجہانپوری

ہر صبح سُنا دیتی ہے افسانے مجھے
ہر شام پلا دیتی ہے پیمانے سب مجھے
دھوکو میں یونہی عُمر کٹی جاتی ہے
دیوانہ سمجھ لیا ہے دُنیا نے مجھے

دُنیا کی وفا ہے بے وفائی کیلئے
یاری کیلئے نہ آشنائی کیلئے
ہیں ڈور و پتنگ کے یہ نقشے سارے
آپس میں ملے بھی تو لڑائی کیلئے

قفس میں مرغِ گرفتار چھیڑ نغمہ ساز
فضائے عالمِ قدسی ہے گوشِ برآواز
جہاں سے قطع تعلق ہے وجہ آزادی
سمجھ نہ قیدِ قفس ہے بہ فرصتِ پرواز

نامعلوم



حقایق و معارف

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے　　کون جانے تجھے کہاں تو ہے

حضرت داغ

مجھ میں رہے وہ پر میں نہ سمجھا کہاں رہے
قالب میں رہ کے روح کی صورت نہاں رہے

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بیگنہ میں بھی گنہگاروں میں ہوں

امیر مینائی

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
بتخانے سے نہ کعبے کی تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

حضرت مومن

بیخودی عشق میں گر خضرِ طریقت ہو جائے　　حق تو یہ ہے غمِ کونین سے فرصت ہو جائے

کیسا بربادی کا غم اور رنجِ رُسوائی کیا
سب سر آنکھوں پہ اگر تیری بدولت ہو جائے
وہ جھٹکتے ہیں تو جھٹکیں مگر اے دستِ طلب
اُنکا دامن نہ چھُٹے چاہے قیامت ہو جائے

فاصلہ کوچۂ جاناں کا نہ پوچھو ہم سے
جیسا مُشتاق ہو نزدیک بھی ہے دُور بھی ہے

اِس طرف بھی کرم اے رشکِ مسیحا کرنا
کہ تمھیں آتا ہے بیماروں کو اچھا کرنا
لے چلا مجکو جنوں کیوں تو بیاباں کی طرف
جب تجھے آتا ہے گھر کو مرے صحرا کرنا

حضرت حنا لکھنوی

نہیں تعظیم کے لایق نہیں تکریم کے قابل
وہ در جسکی طرف خود کھنچ کے پیشانی نہیں جاتی

حضرت منوّر لکھنوی

کسی کمبخت کو ہو گی جو ہو گی فکرِ عصیاں کی
اِدھر دو چار دھبّے ہیں اُدھر رحمت کا دریا ہے

پنڈت کنھیا لال جی پانڈے لکھنوی

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

حضرت غالب

تُو دل نشیں رہے کہ تُو دیدہ نشیں رہے
میں ساتھ ہی ہوں گا ترے تُو کہیں رہے
آنکھیں بچا کے آنکھوں کے پردے میں آ کے بیٹھ
میں بھی یہ چاہتا ہوں تُو پردہ نشیں رہے

بندۂ حق ہو وہی حق سے جو واصل ہو جائے
قطرہ وہ بحر ہے جو بحر میں شامل ہو جائے
نگۂ یاس کشاکش میں پڑی ہے اب تو
موجِ طوفاں کو یہ لازم ہو کہ ساحل ہو جائے

دِل کو کیا کیا نظر نہیں آتا
کوئی تجھ سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈھتی پھرتی ہیں جسے آنکھیں
وہ تماشا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھر دیجاتی ہیں
دینے والا نظر نہیں آتا

اصول جلوہ گری کے عجب نکالے ہیں
کھڑے ہیں بام پر لیکن نقاب ڈالے ہیں

یوں تو دُنیا کے مُرقع میں ہیں تصویریں بہت
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ تری تصویر ہے

عشق کی شورش سے بہتر ہو سکوتِ آرزو
اُس صدا کا کیا ٹھکانا جو صدا پردے میں ہو
اُنکی صورت ہو نظر میں اور وہ دِل میں مقیم
دِلرُبا اک سامنے اک دِلرُبا پردے میں ہو

سُوز میں بھی وہی اِک نغمہ ہے جو ساز میں ہے
فرق نزدیک کی اور دُور کی آواز میں ہے

سر وہ سر ہی نہیں جس میں نہیں سودا تیرا
دل وہ دِل ہی نہیں جس دِل میں تری یاد نہیں

ہُوشاباش اِکیا کہنے ، ترقی اِس کو کہتے ہیں
نہ ترشے تھے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھہرے

آرزوے نُور میں کھویا چلا جاتا ہوں میں
جانے کِس عالم سے گزُرا ہوں کہاں جاتا ہوں میں

تُوہی بتلادے مجھے اے بانیٔ دیر و حرم
دونوں آوازوں میں تیری کونسی آواز ہے
نے میں نغمہ، دیر میں ناقوس، کعبہ میں اذاں
مختلف یہ ساز ہیں گو سب تیری آواز ہے

وصل ہے ، پر دِل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
بُلبُلہ ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے
بے حجابی اِسقدر ، ہر شے میں جلوہ آشکار
اُس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

بیخودی میں دیکھتا ہوں بے نیازی کی ادا
یا فناے عاشقی خود حسن بن جانے میں ہے

گر خدا کعبہ میں رہتا ہے تو بتخانے میں کون؟
ہر ہے گنگا جل میں تو زمزم کے پیمانے میں کون؟
دار پہ اُس کو چڑھایا پر نہ یہ سمجھا کوئی
تھا انا الحق کہہ رہا منصور دیوانے میں کون؟
کس سے باتیں کر رہا ہے اے مرے واعظ بتا
چھپ کے بیٹھا ہے تری تسبیح کے دانے میں کون؟

سمجھ کر اپنا دیوانہ وہ ہم سے منہ چھپاتے ہیں
حقیقت یوں ہے در پردہ محبت آزماتے ہیں

ہمدم نہ ہم نشیں ہے نہ غمخوار ہے کوئی
اس دل کو تیری یاد سے بہلائے جاتے ہیں

عشق کرنا ہی تجھے ناداں اگر منظور ہے
دیکھ تو اُس نور کو جس نور کا تو نور ہے

ڈھونڈھنے والے نگاہِ غور سے آنکھوں کو دیکھ
تیری آنکھوں ہی میں بیٹھا ہے کوئی پردہ کئے

میں سرحدِ حواس سے شاید گزر گیا
جنت کو کہہ رہا ہوں بیاباں ترے بغیر

سمائے جا رہے ہیں اُن کے جلوے میری نظروں میں
تجلی مہر کی اور جذب شبنم ہوتی جاتی ہے

بندگی کا لُطف اور بندہ نوازی کے مزے
پوچھ اُس بندے سے جو بندے کا بندہ ہو گیا

جذب ہے آنکھوں میں میرے اُنکا اندازِ شباب
جس پہ نظریں ڈال دوں گا وہ جواں ہو جائے گا

اِس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں	مشعل دکھائی برقِ تجلّی نے راہ میں

بات یہ کہتی نہیں، کرتی نہیں، سنتی نہیں	بڑھ گئی ہے بے رُخی اتنی تری تصویر کی

جگہ دل لگانے کی دُنیا نہیں ہے	یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

بیخود ایسا ہوں کسی کی لذتِ تقریر سے	پھرِں کرتا ہوں خموشی کا گلہ تصویر سے

دیکھ افشا تری اُلفت کا کہیں راز نہ ہو
اِس طرح توڑ مرے دِل کو کہ آواز نہ ہو
میں بھی ہوں، وہ بھی ہوں، پر ساتھ میں ہمراز نہ ہو
گفتگو تیرے تصوّر میں ہو آواز نہ ہو

یہ کیوں کہوں کہ لگی آگ آشیانے کو
کیا ہے برق نے روشن سیاہ خانے کو

خدا جانے کہاں لیجائے گی وحشت مرے دل کی
میں خود گم گشتۂ منزل ہوں، خبر کیا مجکو منزل کی

ہائے دُنیا دِل سمجھتی ہے جسے وہ دِل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے
اپنے سے جتنا بے خبر اُتنا ہی اُن سے با خبر
جتنا کہ میں بیہوش ہوں اُتنا ہی مجکو ہوش ہے

فریاد کا مزہ ہے لب پر رہے خموشی
آنکھیں یہ کہہ رہی ہوں فریاد کر رہے ہیں

غنچۂ گُل میں دھرا کیا ہے بتا اے بُلبُل
جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے

پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے سبوں کی نظر میں خدا کر چلے

ساری دُنیا مجھے کہتی ترا سودائی ہے　　　اب مرا ہوش میں آنا تری رُسوائی ہے

اِدھر ہوش آیا اُدھر اسکی یاد　　　یہ پھر کھائی ٹھوکر سنبھلتے ہوئے

چونک اُٹھے قبر میں سب قبر کے سونے والے
یہ قیامت ہے یا اُس شوخ کی انگڑائی ہے

یادِ جاناں بھی عجب روح فزا آتی ہے　　　سانس لیتا ہوں تو جنّت کی ہوا آتی ہے

نہیں معلوم وہ خود ہیں کہ محبت اُنکی　　　پاس ہی سے کوئی بیتاب صدا آتی ہے

(نامعلوم)



تصوّف

ہمیشہ ایک سا عالم ہے باغِ ہستی میں
کچھ اس چمن کی بہار و خزاں نہیں معلوم

کرم کرے کبھی اس مشتِ خار و خس پر بھی
ہمارا برق کو کیا آشیاں نہیں معلوم

نظارے گلشنِ ہستی کے روز کرتا ہوں
پر اس چمن کا مجھے باغباں نہیں معلوم

حضرت زندؔ

حرم صنم کا کسی کو مکاں نہیں معلوم
خدا کا نام سنا ہے نشاں نہیں معلوم

اخیر ہو گئے غفلت میں دن جوانی کے
بہارِ عمر ہوئی کب خزاں نہیں معلوم

جہانِ کارِ جہاں سے ہوں بیخبر، بدمست
کدھر زمیں ہے کدھر آسماں نہیں معلوم

چھٹیں گے زیست کے پھندے سے کون دن آتشؔ
جنازہ ہوگا کب اپنا رواں نہیں معلوم

حضرت آتشؔ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

حضرت اقبالؔ

حقیقت میں وہی اس بحرِ ہستی کا شناور ہے
جو موجوں کا سہارا لیکے پھر موجوں سے باہر ہے

حضرت وحشیؔ کانپوری

دماغ و روح یکساں چاہئے اِنسانِ کامل میں
یہ کیا تقسیم ناقص ہے؟ خودی سر میں خدا دِل میں

سر و ساماں کی کچھ حاجت نہیں سودائے اُلفت میں
کہ لے جاتی ہے بیڑی پاؤں پڑ کر دشتِ وحشت میں

صرفِ ہستی کر رہا ہوں وصل کی اُمید میں — بے نشاں ہو لوں تو پھر نام و نشاں پیدا کروں

نہ دیکھ اتنی حقارت سے فلک مجھ بے نوا کو تُو
بلندی آسمانوں کی مری پستی میں پنہاں ہے

باہر نہ آسکی تُو قیدِ خودی سے اپنی — اے عقلِ بے حقیقت دیکھا شعور تیرا

ملائی اے ہوس مٹی میں تُو نے آبرو میری — نکل اب تُو میرے دِل سے نہ میں تیرا نہ تُو میری
بنی تھی بات ضبطِ دردِ غم سے چار سُو میری — مگر اشکوں نے بہ بہ کر ڈبو دی آبرو میری

درد کہتا ہے میں پہلو میں ہوں دل نہ رہے — خواہشِ دل ہی جگر بھی مرے شامل نہ رہے

(نامعلوم)

رندانه

کون احساں اُٹھائے ساقی کا　　انگلیاں کیوں اُٹھیں زمانے کی
آپ اپنے میں مست رہتا ہوں　　کیا ضرورت شراب خانے کی

سنیہی جی کانپوری

بے تعلّق زندگی اچھّی نہیں　　زندگی کیا موت بھی اچھّی نہیں
یہ ہوا، یہ ابر یہ سبزہ حفیظ　　آج پینے میں کمی اچھّی نہیں

حضرت حفیظ جالندھری

سوزِ جگر سے شمعِ شبستاں بغل میں ہے　　داغوں کی روشنی سے چراغاں بغل میں ہے
کیا خوف ہے جو دفترِ عصیاں بغل میں ہے　　آنکھیں سلامت اشک کا طوفاں بغل میں ہے
واعظ کتابِ وعظ لئے ہے تو کیا ہوا　　بوتل شراب کی بھی تو پنہاں بغل میں ہے

لُطف تب ہو کہ ادھر ہاتھ میں بوتل آئے　　اُس طرف جھُوم کے گلزار میں بادل آئے
وہ سیہ مست ہوں ساقی کہ اگر پہلو میں　　دل کو ڈھونڈھوں تو مرے ہاتھ میں بوتل آئے
توبہ کرنی تھی کہ بوچھار ملامت کی ہوئی　　خوب ہی مجھ پہ برستے ہوئے بادل آئے
طالبِ مرگ بھی ہیں مُنتظرِ یار بھی ہیں　　دیکھئے کون شبِ ہجر میں اوّل آئے

اِتنا اثر تو شیخ کی صحبت کا ہے امیرؔ
ہاتھوں میں جام لب پہ ہے توبہ لئے ہوئے

حضرت امیرؔ

مے سے غرض نشاط ہے کِس رُو سیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دِن رات چاہئے

حضرت غالبؔ

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے تیرا
جو پھول کھِلا باغ میں پیمانہ ہے تیرا

حضرت چکبستؔ

چھوڑ دو دانۂ تسبیح جو چکھ لو اے شیخ
ایک قطرہ بھی چھلکتے ہوئے پیمانے کا

حسرت صاحب بریلوی

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دِل حُباب کا
پانی بھی گر پئیں تو مزہ ہو شراب کا

حضرت سوداؔ

پیوں گا آج ساقی سیر ہو کر
میسّر پھر شراب آئے نہ آئے
پلا دے بادۂ گلرنگ ساقی
گھٹا پھر اِس طرح چھائے نہ چھائے

ساقیا عکس پڑا ہے جو تری آنکھوں کا
اور دو جام نظر آتے ہیں پیمانے میں

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
کیوں نہیں چلتی گلے پر تیغ ناز
عید کیا ابکی بھی خالی جائے گی
دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ
شاید اسمیں جان ڈالی جائے گی
اے تمنا تجکو رد لوں شام وصل
آج تو دل سے نکالی جائے گی

کل شب کو یار میر اجائے گا میکشی کو
شبنم سے جا کے کہدو پیالے گلوں کے دھو دے

مے مری توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

باغ میں چلنے لگے تیر نگاہِ میکش
مے ٹپکنے لگی انگور کے ہر دانے سے

ہائے یہ ٹھنڈی ہوا، یہ ابر، یہ رُت، یہ بہار
کر چکا ہوں توبہ نیت پھر بھی پیمانے میں ہے

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو

بزم میں ساقی نے دیکھا جو نگاہِ لطف سے
بادہ نوشوں کیلئے انگور آنکھیں ہو گئیں

مے کشو! مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اُڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

تردامنی پہ میرے نہ زاہد نہ جائیے
دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

اِقسام شرابوں کی مت پوچھ، پلائے جا
میخانے میں جو تیرے ہو گی وہ کھری ہو گی

جانتا ہوں میں تری تنگ دلی کو ساقی
اِس لئے اوک سے پیتا ہوں کہ اندازہ نہ ہو

قابلِ تعریف کیا تقسیم میخانے میں ہے
جتنی جس کی پیاس اُتنی اُس کے پیمانے میں ہے
بیش و کم پر بحث رندوں کو نہ کرنی چاہئے
ایک ہی شے ہے جو خم میں اور پیمانے میں ہے
جس قدر ساقی پلائے اُس قدر پی لیں شراب
کیا بڑے سے خُم میں کیا چھوٹے سے پیمانے میں ہے

ساقی تو میرے جام پہ کچھ پڑھ کے پھونک دے
پیتا بھی جاؤں اور بھری کی بھری رہے

نامعلوم



فن

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

سفر میں زندگی کے سو گیا ہوں تھک کے منزل پر
اجل کے نام سے بدنام ہے خوابِ گراں میرا

نہ کوئی دوست و دشمن ہو شریکِ دردِ غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا
لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

حضرت چکبست

فنا کے سامنے ہم کیا ہماری ہستی کیا
برائے نام مگر اک نشان پا ہی لیا
سبا جو ہم نفسِ قطرہ ہو گئی دم بھر
حباب نے بھی خودی کا مزا اٹھا ہی لیا

حضرت اکبر

یہ ہستی و عدم بحرِ فنا کے دو کنارے ہیں
جو اِس ساحل سے ڈوبے گا وہ اُس ساحل سے نکلے گا

ذِکتک صاحب لکھنؤ

فانیؔ دوا سے دردِ جگر نہ ہو تو نہیں　　کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

حضرت فانیؔ

زیست بھاری تھی مسیحا ترے بیماروں پر　　جی گئے، موت کو رحم آگیا بیچاروں پر

حضرت حنا لکھنوی

ساتھ تکلیف کے جینے کو اجل کہتے ہیں　　زندگی نام ہے آرام سے مر جانے کا

حضرت صاحب بریلوی

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے　　جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے

حضرت انیسؔ

جس سے دُنیا نے آشنائی کی　　اُس سے آخر کو کج ادائی کی

حضرت حالیؔ

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں مُوند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حضرت میرؔ

ہستی سے عدم تک ہے نفسِ چند کی ہے راہ دُنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

حضرت سودا

لحد میں مُنہ چھپائے کیوں نہ جاؤں بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

حضرت شاد عظیم آبادی

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

حضرت غالب

فنا کے راز کی دُنیا کو کچھ خبر ہی نہیں ہے یہ وہ شام کہ جسکی کوئی سحر ہی نہیں

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گُل اندام اِس میں
اِس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

فنا اک آئینۂ شور زارِ ہستی ہے یہ وہ سکوت ہے جو پردہ دارِ ہستی ہے
شکستِ زمزمۂ سازِ زندگانی ہے کتابِ عُمر کی اک آخری کہانی ہے
یہ وہ شراب ہے جس کا کوئی خُمار نہیں یہ وہ نشہ ہے کہ جس کا کوئی اُتار نہیں
اجل کے ہاتھ میں انسان اک کھلونا ہے جسے کسی نہ کسی دن تباہ ہونا ہے

تسکیں اگر نہ ہوگی دلِ بیقرار کو
جنبش رہے گی بعدِ فنا بھی مزار کو

تربت مرے مکاں سے کچھ دُور تھی نہ اتنی
پہونچا مرا جنازہ کاندھے بدل بدل کر
ملکِ عدم میں یارب کیا عید ہو رہی ہے
جاتے ہیں جانے والے کپڑے بدل بدل کر

راستہ ملکِ عدم کا ہے بنایا کیا صاف
موند کر آنکھ چلے جاتے ہیں جانے والے

راستہ مُلکِ عدم کا کم نہیں
وہ چلے جاتے ہیں جن میں دم نہیں

واللہ قبر تک نہ گیا کوئی پانوں پانوں
اس سے یقیں ہوا کہ یہ منزل بھی دُور ہے

موت کیا ہے زندگی کی دوسری تصویر ہے
جس نے اس رُخ سے اُسے دیکھا وہی کامل ہوا

زندگی پا کر ہوا سارا زمانہ بے خبر
موت بھی آ نگئی اک دن اس کا کس کو ہوش تھا

ہستی میں اور عدم میں کچھ فرق ہے تو اتنا
اک ہے تری کہانی اک میری داستاں ہے

حقیقت کیا بشر کی ہے، ہے اک تعمیر مٹی کی
اور مٹی ہی میں ملنے کو، ہے یہ تصویر مٹی کی

بس اِتنا فرق ہے انسان میں اور اُسکی تُربت میں
وہ ہے اِک ڈھیرِ مٹی کا یہ ہے تصویر مٹی کی

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

عالمِ ہستی نہیں ہے دِل لگانے کی جگہ
آنے والی ہوتی ہیں سب جانے والی صورتیں

میں تنہا نہ تن بلکہ جاں بیچتا ہوں
یہ ہستی کی ساری دُوکاں بیچتا ہوں
دو گندم پہ آدم نے جنّت کو بیچا
میں اک تل پہ دونوں جہاں بیچتا ہوں

گوشۂ قبر سے بڑھکر کہیں آرام نہیں
لوگ سوتے ہیں یہاں پانوں پسارے کیا کیا

مِرے لاشے کو عُریاں بیچ دریا میں ڈبو دینا
میں پانی ہی کی چادر کو بنا لوں گا کفن اپنا

ایسی گئی کہ مُڑکے بھی دیکھا نہ پھر کبھی
گویا بدن سے روح کبھی آشنا نہ تھی

فخر کرتے ہیں کہ رکھتے ہیں دلِ درد آشنا
ورنہ کیا رکھا ہے ترتیبِ عناصر کے سوا

کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

اگر کون و مکاں اک شعبدہ تھا اُسکی قدرت کا
تو اس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہید یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

حیف ہے جینے کی تو اک آدھ گھڑی باقی ہے ۔ مئے مرے حصے کی شیشے میں بھری باقی ہے
موت کہتی ہے کہ لبریز ہے پیمانۂ عمر ۔ دوست کہتے ہیں کہ امید ابھی باقی ہے

معلوم ہے ہمیں سب بلبل تری حقیقت
اک مشت استخواں ہے دو پر لگے ہوئے ہیں

کیوں مٹی جاتی ہے رنگینیٔ گل پہ بلبل ۔ ہم نے دیکھا ہے بہاروں کا خزاں ہو جانا

پھپھولے اُن کو نہ سمجھو صاحب یہ زخم پہلو بدل رہے ہیں
اندھیری تربت میں عاشقوں کی چراغ حسرت کے جل رہے ہیں

جسے موت مانگے نہ ملتی ہو واللہ ۔ وہی زندگی کا مزا جانتا ہے

گُل چڑھائیں گے لحد پر جن سے یہ اُمیّد تھی
وہ بھی پتھّر رکھ گئے سینے پہ مر جانے کے بعد

فقط اس آسرے پر رات کاٹی شمع نے رو کر
کہ شاید صبح تک زندہ مرا پروانہ ہو جائے

مختصر رودادِ غم یہ ہے دلِ ناکام کی
ایک ہچکی آئی وہ بھی بے کسی کے نام کی
موت کی آغوش میں ہے رازِ ہستی کا ظہور
صبح کا آغاز گویا ابتدا ہے شام کی

اے شمع کچھ بھی خبر ہے تجھے پروانوں کی
لاش پر لاش پڑی ہے ترے دیوانوں کی

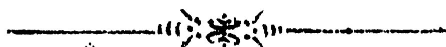
گُل ہنسے، برق نشیمن پہ گری، قید ہوا
مرے گلشن پہ خزاں بن کے بہار آئی ہے

شمع میں ہمّت کہاں جو ایک پروانے میں ہے
لطف جینے میں نہیں جل جل کے مر جانے میں ہے

امتحاں سوزِ محبت کا ہُوا کرتا ہے یوں
تم نے دیکھا؟ جل گئی ہے شمع پروانے کے بعد

لاش پروانے کی کہتی ہے زبانِ حال سے
بولتی محفل میں اک خاموش محفل چاہیے

نامعلوم



رنگِ تغزّل

اِک بار فقط پوچھ لے کیا حال ہے تیرا　　کافی ہے یہ دوا ترے بیمار کے لئے

چھنّا مہراج لکھنوی

میں پیشکش میں نذر کروں جان اے طبیب　　پہلے تری دوا سے کچھ آرام بھی تو ہو
"حامی" تمھیں عزیز رکھیں بُت تو کیا گُناہ　　تم اِن بتوں کے عشق میں بدنام بھی تو ہو

حضرت حامی

غضب ہے شوخی قدم قدم پر کھِلا ہے گلزارِ نقشِ پا کا
قدم اُٹھائے جہاں سے وہ گُل نگاہِ عاشق وہیں پہ ناچے
ہمارے گھر بھی، عدو کے گھر بھی گئے مگر فرق اِسقدر تھا
کہیں تو بُت بن کے آپ بیٹھے، گلے لپٹ کر کہیں پہ ناچے

تسلّی کے لئے رکھّا تھا یا شُعلے اُٹھانے کو　　لگا دی آگ سینے پر ترے دستِ حنائی نے

حسرت صاحب بریلوی

ضبط کرتا ہوں تو ہر زخم لہو دیتا ہے　　نالہ کرتا ہوں تو اندیشۂ رسوائی ہے

حضرت سحر

دِل دینے میں کچھ اور مجھے ڈر تو نہیں ہے　　اتنا کوئی کہدو وہ ستم گر تو نہیں ہے

منظرِ تصویرِ دردِ دل مٹا سکتا نہیں　　آئینہ پانی تو رکھتا ہے پلا سکتا ہے

جلوۂ حسن میرے دِل میں نمایاں کردو　　شمع ایوانِ تصور کو فروزاں کردو
تا کہ ملتا ہے مجھکو شرفِ پابوسی　　ہے یہ بہتر مجھے سنگِ درِ جاناں کردو

جانستانی کے تو غمزے تمھیں لاکھوں معلوم　　مرے جی اٹھیں کوئی ایسی ادا بھی آئی

حضرت حنا لکھنوی

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب　　دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن　　خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگِ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

حضرت اسدؔ

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　　آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

حضرت غالب

عشق آدابِ طلب بنکے نہ رہ جائے کہیں　　تم نہ اٹھنا مجھے محفل سے اٹھانے کے لئے

حضرت آسی

آ گئی ہے ترے بیمار کے مُنہ پر رونق جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

حضرت فانیؔ

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں ستم نہ ہو تو محبّت میں کچھ مزا ہی نہیں

حضرت اقبالؔ

ایک آنسو کی بوند نے کھو دی بات جو تھی رہی سہی دِل کی
نہ سہی وصل آسرا دیدو کچھ تو بڑھ جائے زندگی دِل کی

آئینہ اُٹھا لائے اور عکس سے یوں بولے کیوں بات نہیں کرتا جو تُو ہی وہی میں ہوں

نہیں سیندور کا ٹیکا یہ ہمارے دِل کا قطرہ ہے
چڑھا ہے سر پہ قاتل کے مرے خوں کا نشاں ہو کر

دونوں زُلفیں اُن کی ہلتی ہیں مرے نالے پہ آج
وجد کرتا ہے صدا سے نَے پہ جوڑا سانپ کا

زُلف اُن کی اور مری قسمت کی بندش ایک ہے
وہ بھی بَل کھائی ہوئی اور یہ بھی بَل کھائی ہوئی

ہوا سے بال اُن زلفوں کے رُخساروں پہ ہلتے ہیں
دلِ بیمار اُٹھ بیٹھو کہ دونوں وقت ملتے ہیں

عوارض پُر عرق پر کاکُلِ پیچاں لٹکتے ہیں
سُنا ہے سانپ اکثر چاٹنے شبنم نکلتے ہیں

گرہ کھُلتے ہی ہر جانب سے نکلا غول کالوں کا
پٹارا ہے سپیرے کا یا جوڑا اُن کے بالوں کا

مانگ اُنکی گرچہ سیدھی راہ ہی ظُلمات کی
خضر کو بھی ہو مُسافت ایکدن دو رات کی

اگر تم دِل ہمارا لے کے پچھتائے تو رہنے دو
نہ کام آئے تو واپس دو جو کام آئے تو رہنے دو
مِرا رہنا تمھارے در پہ غیروں کو کھٹکتا ہے
اگر کہدو تو اُٹھ جاوں جو رحم آئے تو رہنے دو
دِل اپنا بیچتا ہوں، واجبی دام اک نظر رحمت
جو قیمت دو تو لو، قیمت نہ دی جائے تو رہنے دو

پسِ مُردن کفن میں یار کی تصویر رکھدینا
کٹے گی راہ اس صورت سے اچھی پہلی منزل کی
وہ کیا جانے کہ دِل دیکر کسی پر کیا گزرتا ہے
دیا ہوتا کسی کو دِل تو کرتے قدر بھی دِل کی

ہے خنجر کُند، نازک ہاتھ اُنکے، سخت جاں میری — الٰہی آبرو مقتل میں رکھنا میرے قاتل کی

نہیں ہے مانگ میں سیندور کی یہ سیدھی لکیر
سپر پہ رکھدی ہے قاتل نے خوں بھری شمشیر

سیاہی آنکھ کی لیکر میں نامہ تمکو لکھتا ہوں — کہ جب نامے کو تم دیکھو، مری آنکھیں تمھیں دیکھیں

ساقی کا عکسِ رُخ نہیں جامِ شراب میں — وہ چاند ہے جو ڈوب گیا آفتاب میں

شکایت کس زباں سے میں کروں اُنکے نہ آنے کی
یہی احسان کیا کم ہے کہ میرے دِل میں رہتے ہیں

کیا مُنہ مرا شکوہ جو نکالوں میں زباں سے — دِل پہلو میں بیٹھا ہے طرفدار تمھارا

نزع میں سامنے آنے کا نتیجہ یہ ہوا — پُتلیوں میں تری تصویر اُتر آئی ہے

دو گھڑی دِل کے بہلنے کا سہارا بھی گیا — لیجئے آج تصوّر میں بھی تنہائی ہے

دردِ دل حُسن کی ہی سینک سے اچّھا ہوگا — آؤ پہلو میں جو دعوائے مسیحائی ہے

جفائیں تم کئے جاؤ، وفائیں ہم کئے جائیں　　ہمیں اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنے بیوفا تم ہو

بھرے بیٹھے تھے شکوؤں کا ذخیرہ دل میں ہم اپنے
گلے سے اُن کا آ لگنا مرا مجبور رہ جانا
کہاں سے درد کہکر ہاتھ رکھنا اُن کا سینے پر
مرا جھوٹا ٹھہرنا درد کا کافور ہو جانا

کلیجہ کھینچکر لب تک مری آہِ رسا لائی　　مگر اوبے خبر تجکو نہ لے آئی تو کیا لائی
گلوں میں یہ نہ تھی قدرت کہ رنگ اسکا اڑا لاتے　　مگر تو کیوں نہ بوے یار لے بادِ صبا لائی
گئے وہ روٹھکر تو میں بھی کھنچ بیٹھا وہ خود آئے　　تعجب ہے کہ میری بے رُخی اُنکو منا لائی

کلیجے میں چھپا کر کس جگہ نوکِ سناں رکھدی
پرائی چیز تھی اے درد بتلا تو کہاں رکھدی؟

رکھدیا دستِ حنائی جو کبھی پانی پر　　مچھلیاں چیخ اُٹھیں آگ لگا رکھی ہے

صبا آہستہ چل نازک طبع بیدار ہوتا ہے　　منع کر گل کی کلیوں کو نہ چٹخیں یار سُوتا ہے

صبا ملنا تو کہدینا مرے کھوئے ہوئے دل سے　　کہ تیری آرزو میں زندگی کٹتی ہے مُشکل سے

لگا دے آگ گر وہ شعلۂ عارض سے گلشن میں
کبابِ سیخ سمجھیں بلبلیں شاخِ نشیمن کو

گرمیِ حسن ہے سینے سے پسینہ پونچھو   یہ نہ جائیں یہ جوانی کے ثمر پانی میں

ڈوپٹا لاکھ سینے پر سنبھالو کب سنبھلتا ہے   کہیں بھی ایک کا دو مشرکینوں پر زور چلتا ہے

نتھ جو اس شوخ نے پہنی ہے کچھ زینت کو نہیں   حسن کو ناتھ رکھا ہے کہ نہ جا اور کہیں

کاکل نے پیچ ڈالا ہے پستانِ یار پر   سایہ جنوں کا رہتا ہے اکثر انار پر

ابھی سینے کو ڈوپٹے سے ڈھکا رہنے دو   آم کچے ہیں ابھی پال دبا رہنے دو

سنے گا کون طعنے روز ان کی چارہ سازی کے
مسیحائی وہ رکھ چھوڑیں ہمیں بیمار رہنے دیں
نشاں رہ جائے کچھ باقی مرے جیب و گریباں کا
مرے دستِ جنوں اتنا کریں دو تار رہنے دیں

جبر کا اختیار کون کرے   تجھ سے ظالم کو پیار کون کرے

آپ کا وعدہ آپ کا دیدار — حشر تک انتظار کون کرے
زندگی ہے ہزار غم کا نام — اس سمندر کو پار کون کرے
آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا — زیست کا اعتبار کون کرے

یوں پھر رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں — آلودہ میرے خون سے داماں کئے ہوئے

دکھادیں گے جوشِ جنوں کا تماشہ — جو زندہ رہے ہم بہار آتے آتے

گو دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں — میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

طفلی مچل رہی ہے کہ میں عمر بھر رہوں — موقع کی منتظر ہے جوانی نقاب میں

دل سے تھم تھم کے ذرا کھینچنے والے کھینچیں — ہر ایک تیر میں لپٹے ہوئے ارماں ہوں گے

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

کبھی یہ دل تماشہ گاہ تھا عیش و مسرت کا
اب اس میں حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں

ستارے جو سمجھتے ہیں غلط فہمی ہی یہ انکی　　فلک پر آہ پہونچی ہے مری چنگاریاں بنکر

کب کسی کے قتل کو نکلی تیری تیغِ نگاہ　　ایک جنبش دی اگر پلکوں کو سو خنجر چلے

محفل کے بیچ سن کے مرے سوزِ دل کا حال　　بے اختیار شمع کے آنسو نکل پڑے

جس کو تم آسمان کہتے ہو　　وہ دلوں کا غبار ہے اپنا

پہلوے گل میں خار بھی کچھ بے سبب نہیں　　ہے حسن تولنے کو اک کانٹا لگا ہوا

مژہ پر اشک کے رُکنے کا راز اب ہم پہ کھلتا ہے
گر اں قیمت گہر ہے اس لئے کانٹے پہ تلتا ہے

چمن سینچا یہاں تک باغباں نے خونِ بلبل سے
کہ آخر رنگ ہو کر پھوٹ نکلا عارضِ گل سے

بزمِ عشاق ہی کیا جانے کدھر دیکھیں گے　　دل تو دیتا ہے گواہی کہ ادھر دیکھیں گے
ایک دل، ایک جگر لایا تھا دونوں چھینے　　اب مرے پاس رہا کیا جو ادھر دیکھیں گے
دن بدن حسن بڑھے گا وہ بڑھینگے جیسے　　دیکھنا یہ ہے اس عالم میں کدھر دیکھیں گے

کبھی وہ جان کا دشمن وہ قاتل یاد آتا ہے
کبھی پہلو کو خالی دیکھ کر دل یاد آتا ہے
گزرتا ہے نظر سے جب بھلا پھولا کوئی دشمن
تو پھر اُن ہمکو اپنا رنگِ محفل یاد آتا ہے

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

خال ہیں، خط ہیں، یا گیسوئے خمدار میں ہے
دلِ گم گشتہ ہمارا انھیں دو چار میں ہے
دیکھ لیں گے تجھے آئینۂ دل ہی میں صنم
ہرج کیا گو نہیں روزن تری دیوار میں ہے
ہو گیا زندۂ جاوید کیا قتل جسے
مزۂ تندِ مکرر تری تکرار میں ہے

فرطِ غم میں رُک گئے مژگاں پہ آکے اشکِ چشم
ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہو گیا
آتشِ اُلفت یہاں تک دل میں ہے بھڑکی ہوئی
مُنہ سے حرفِ آہ جو نکلا شرارا ہو گیا

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم انکی نہیں جاتی
نگہ نیچی کیئے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

دید کے قابل تماشہ ہے مری تقدیر کا
آئینہ سا بن گیا ہوں میں تری تصویر کا

سامنے اُنکے پہونچ کر کس لئے خاموش ہے ۔ نامہ بر کیا کھو دیا لکھا مری تقدیر کا ؟
دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مُنہ سے کچھ نہ بول ۔ آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

آئینہ کی آنکھ سے لڑتی ہو جب عاشق کی آنکھ ۔ چاہتی ہے چھین لے لذت ترے دیدار کی

اے بتو تم میں اگر مہر و محبت ہوتی ۔ کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا

کوڑیالا مری تُربت پہ لگانا یارو ۔ ناگنی زُلف کا مارا ہے یہ پہچان سے ہے

کشتہ ہوں اسکی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح ۔ کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا!

قریب ختم تھی محفل کہ آ نکلے اِدھر وہ بھی
غرض واعظ کی محنت رہ گئی سب رائگاں ہو کر
نگاہیں میری اُنکی مل گئی تھیں رات محفل میں
یہ دُنیا ہے بس اتنی بات پھیلی داستاں ہو کر

شوقِ پا بوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز ۔ گھاس جو اُگتی ہے تُربت پہ چنا ہوتی ہے

جب ملے دو دل مُخل پھر کون ہے ۔ بیٹھ جاؤ، خود حیا اُٹھ جائے گی

یہ اضطرابِ شوق تو بلبل کا دیکھئے　　　　وہ چاہتی ہے گود میں لیلوں بہار کو

دل تو لیتے ہو، لے جاؤ، مگر سُن تو لو　　　　جب ہمارا نہ ہوا، کب یہ تمہارا ہو گا؟

وصل کے بعد بھی دل کی ہے وہی بیتابی　　　　نہیں معلوم کہ اس دل کی تمنّا کیا ہے

جانا نہ میری قبر پہ ہمراہِ رقیباں　　　　مرنے پہ مسلمان جلائے نہیں جاتے

آتشیں رُخ پہ تیرے خال کا آنا کیسا؟　　　　قائم انگار پہ بارود کا دانا کیسا

وہ سینے پہ رکھتے نہیں دستِ تسکیں　　　　مسلنے کو چٹکی سے دل ڈھونڈھتے ہیں

رکھ دیئے گال جو اُن آتشیں رُخسار وں نے　　　　دل کو تھا چین تو نیند آ گئی انگاروں پہ

ہم نے پالا مدتوں پہلو میں ہم کوئی نہیں　　　　تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہو گیا

نامعلوم

ظرافت

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں، ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا
اس حورِ لقا کو گھر لائے ہو تم کو مبارک لے اکبر
لیکن یہ قیامت کی تم نے گھر سے جو نکلنا چھوڑ دیا

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
میوزک بھی اگر ہو تو کوئی ہرج نہیں ہے — اُستاد بھلے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں

منقرضئے گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا — اسکو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

میری یہ بے چینیاں اور انکا کہنا ناز سے — ہنس کے تم سے بولتے ہیں ور اب ہم کیا کریں

شمشیر زن کو اِک نئے سانچے میں ڈھالیئے — شمشیر کو چھپائیے زن کو نکالیئے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ کہلا دیا
آپ بی اے پاس ہیں تو میں بھی "بی بی" پاس ہوں

حضرت اکبر الہ آبادی

شادی ہے دخترِ زر کی جہاں ہیں سب بارات لیکے جھومتے پیرِ مغاں چلے

باندے جی

کیوں حشر ہے یہ برپا تھوڑی ہی جو پی لی ہے ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری کی واعظ کی ہیں یہ باتیں اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

یہ سیّد جو اب زلف والے ہوئے ہیں ہمارے ہی سب بل نکالے ہوئے ہیں

یہ اے شیخ گنبد نہیں مسجدوں کے خم نے ہمارے اچھالے ہوئے ہیں

حضرت ریاض خیرآبادی

پلائی جو اس نے شرابِ محبّت تو نالی ہیں تھے سب خرابِ محبّت

یہ مصرع ہے درجِ کتابِ محبّت جوانی ہے خانہ خرابِ محبّت

شب و روز وقفِ سرِ عاشقاں ہے وہ پاپوش ہے یا عذابِ محبّت

نقاب اس نے الٹی جو روئے سیہ سے تو مغرب میں تھا آفتابِ محبّت

مذاق ایک دن عاجزی کرکے ان سے

بمشکل ہوا فیضیابِ محبّت

راہِ خرابِ عشق میں مجھ سے کوئی سوا نہیں
سب کا چچا ہوں میں "مذاق" میرا کوئی چچا نہیں
ضبط کی گن چلی نہیں، شوق کا بم پھٹا نہیں
شکر ہے دامِ حسن میں عشق ابھی پھنسا نہیں
جوشِ جنوں سے کام لے ہوش یہاں روا نہیں
وہ نہیں اہلِ عشق جو عشق میں چوتیا نہیں
رنج و الم کی لادیاں لاد رہے ہیں آپ کیوں
جائیے بھاگ جائیے عشق کوئی گدھا نہیں
دونوں ہیں داو گھات میں فکر ہے کھینچ کھانچ کی
ڈور ابھی ملی نہیں پیچ ابھی پڑا نہیں
حاصلِ کائنات ہے، زینتِ کائنات ہے
پھینک رہے ہیں آپ کیوں؟ دل مرا ٹھیکرا نہیں
ریشِ دراز شیخ کو چوم کے یار نے کہا
اس سے زیادہ خوشنما چیل کا گھونسلا نہیں
اس نے بصد غضب یہ آج شوہر پیر سے کہا
تو وہ چراغ کشتہ ہے، بجھ کے جو پھر جلا نہیں
لاکھوں رقیب پٹ گئے یار کی بزم ناز میں
شکر نہ کیوں کروں مذاق خیر سے میں پٹا نہیں

محبّت باعثِ شُکرِ حماقت ہوتی جاتی ہے
مذاق آہستہ آہستہ حجامت ہوتی جاتی ہے
مزے کی واعظو ساقی میں حجّت ہوتی جاتی ہے
شراب و ریش دونوں کی مذمت ہوتی جاتی ہے
اُدھر مہنگی کا یہ عالم اِدھر بچّوں کی یہ ریزش
غضب میں جان ہے پیہم حماقت ہوتی جاتی ہے
سیہ صورت کے جلوے اس پہ یہ آرایشِ رنگیں
قیامت اور بالائے قیامت ہوتی جاتی ہے
مذاق اُس شوخ نے مارا ہمیں نا آشنا بنکر
یہ عالم ہے کہ اب دل کی بُری گت ہوتی جاتی ہے

مضمونِ نَو بنَو کی قسم کھا رہا ہوں میں
سب عرض کر چکے ہیں تو فرما رہا ہوں میں
تاثیر جذبِ عشق سے گھبرا رہا ہوں میں
اُس نے شراب پی ہے گرا جا رہا ہوں میں
ظالم کے ٹیپ جھاڑ کے پچھتا رہا ہوں میں
اپنا سرِ عزیز بھی سہلا رہا ہوں میں
داڑھی خضاب خوردہ ہی اترا رہا ہوں میں
دُنیا کو پھر جوان نظر آ رہا ہوں میں
سوزِ غمِ فراق سے گھبرا رہا ہوں میں
گنگا کی سمت ہائے چلا جا رہا ہوں میں
جوشِ جنوں میں حد سے بڑھا جا رہا ہوں میں
پیپل پہ چڑھ کے چونچ انھیں دکھلا رہا ہوں میں

شاید اسی طرح سے مٹے کمسنی کی ضد — کپتان کھلائے یار کو پھسلا رہا ہوں میں
اب اُنکی بزمِ ناز میں جو بھی سلوک ہو — بے روک ٹوک اب تو گھسا جا رہا ہوں میں
شانہ نہیں ملا تو کھرا لئے ہوئے — زُلفِ طویلِ یار کو سُلجھا رہا ہوں میں
سیرِ جہانِ عشق ہے ایروپلین سے — اُنکو لئے مذاق اُڑا جا رہا ہوں میں

حضرت مذاق کانپوری

رُباعی

ارباب زمانے کی حماقت توبہ — ہر لب پہ انھیں کی ہے شکایت توبہ
اُستاد کی داڑھی ہوئی ہر تال سی صاف — اسکول کے لڑکوں کی شرارت توبہ

حضرت مذاق کانپوری

دھول دھپّہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

حضرت غالب

درپردہ تم جلاؤ، جلاؤں نہ میں چہ خوش — میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

حضرت داغ

چاہِ ذقن کے شوق میں عشقِ قدِ دراز میں
دل ہے کبھی نشیب میں دل ہے کبھی فراز میں

قصر کی ڈاٹ بڑھ گئی چھجّہ سڑک پہ آگیا
پھانس لیا ہے یار کو چونگی نے بائی لاز میں

میری طرف تھا اضطراب، اُنکی طرف تھا اجتناب
چلتی رہی تمام شب ناز میں اور نیاز میں

کر کے وہ مرغِ دل کو ذبح کہنے لگے بنا کے مُنہ
یہ بھی کوئی شکار ہے ٹیل میں ہے نہ قاز میں

عشق میں اور حسن میں پردے سے یہ مُراد ہے
عشق رہے لنگوٹ میں حُسن ہو پیشواز میں

کہتے ہو کہ "میں حسن میں لیلیٰ سے سوا ہوں"
سُنتے ہو! "کہ میں عشق میں مجنوں کا چچا ہوں"
ہے آنکھ کا دعویٰ کہ "میں ساون کی گھٹا ہوں"
اور اُن کا یہ کہنا ہے کہ میں چکنا گھڑا ہوں
میں حضرت مولانا کی صورت پہ فدا ہوں
ڈاڑھی کا اشارہ ہے کہ زُلفوں کی بُوا ہوں
چھ انچ کے پیمانے سے اللہ رے ہمّت!
طولِ شبِ ہجراں کو پڑا ناپ رہا ہوں
سر چڑھ کے کہا یار کی پاپوش نے مجھ سے
سُنتے ہو! میں سودائے محبت کی دوا ہوں
دُنیا کی طرح گول ہے کیا عشق کی دُنیا
جس جا سے چلا تھا میں وہیں آکے رُکا ہوں

مُرغانِ چمن چِگتے چہکتے ہیں مجھی سے
اب آپ سمجھ جائیے میں کون ہوں کیا ہوں
حد ہو گئی تذلیل کی اے چرخ کہ برسوں
کُتّوں کی طرح کوچۂ جاناں میں پھرا ہوں

حضرت پرنم شاہجہانپوری

کیا جانے اُسے کیا ہے وہم میری طرف سے — جو رات کو بھی خواب میں تنہا نہیں آتا

شربتِ وصل تو لکھا ہی نہیں نسخے میں — اے طبیبو تمہیں کیا خاک دوا آتی ہے

عُناب لب، لعابِ دہن، شربتِ وصال — نسخہ یہ چاہیئے ترے بیمار کے لئے

سبزۂ خط ہے رُخِ یار پہ یا کائی ہے — پیش خیمہ ہے خزاں کا کہ بہار آئی ہے

اوس میں سوتا نہیں ہرگز ہوں وہ عالی دماغ — میری تُربت پر بنی رہتی ہے چھپّر چاندنی
داغِ دل پہونچا گیا ہم کو درِ دلدار تک — ہے مُسافر کی شبِ غربت میں رہبر چاندنی
ساتھ زردی کے سفیدی بھی ہے اس میں جلوہ گر — یا خدا کیونکر گھسی انڈے کے بھیتر چاندنی

معشوق گر نہ ہوتے عاشق نہ ہوتے پیدا — یہ سچ ہے اے حسینو تم عاشقوں کی ماں ہو

زُلف کو جب اُس بُتِ ناداں نے اپنے بل دیے
دیکھ کر کوڑے کی صورت حضرتِ دل چل دیے

مرا خط پھینک کر قاصد کے مُنہ پر طنز سے بولے
خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں"

کانے معشوق سے بہتر ہے ٹینگا معشوق — آنکھ ٹیڑھی ہے مگر یار کی ترچھی نظر تو ہے

گو کسی کام کا ہوتا نہیں بھینڈا معشوق — کانے عاشق کو ملے مُفت تو ٹھینگا کیا ہے

چھُوا انگور زاہد نے تو میں سمجھوں گا محشر میں
وہ نے کی گولیاں کھاتا تھا میں پیتا تھا ساغر میں

رات بھر خوب پی اور صبح کو توبہ کر لی — رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

سچ کہا زاہد یہ تو نے زہرِ قاتل ہے شراب
میں بھی کہتا تھا یہی جب تک بہار آئی نہ تھی

کہاں ہے دخترِ رز اے محتسب ہم بادہ خواروں میں
ترے ڈر سے وہ کافر جا چھپی پرہیزگاروں میں

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق اتنا ہے
کہ یہ جامے سے باہر ہے وہ پیجامے سے باہر ہے

رقیبہ تمہارے گانوں کا میلوں ہوا تو کیا
رقیبہ تمہارے دل کا تو دوا انچ بھی نہیں

آئینہ دیکھ رہا ہے سرِ محفل قاتل
مجکو ڈر ہے کہیں لڑ جائیں نہ قاتل قاتل

کمر خمیدہ نہیں بے وجہ ضعیفی میں
زمین ڈھونڈھ رہے ہیں مزار کے قابل

شباب اپنا جو وہ کھو چکے ہیں حضرتِ دل
اسی کو ڈھونڈھ رہے ہیں کمر جھکائے ہوئے

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

جنت پرست زاہد ہے اک حق پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے وہ شہوت پرست ہے

تری تصویر میں تجھ سے ادا اک یہ نرالی ہے
جی چاہے جتنا لپٹا لو نہ غصہ ہے نہ گالی ہے

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے ہاتھ لا اُستاد، کیوں کیسی کہی

دفتر کھُلے گا جبکہ حساب و کتاب کا معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
جو چاہے لکھ لے کاتبِ اعمال حشر میں پھونکوں گا ایک آہ میں دفتر حساب کا

چڑھا ہے رنگ کچھ ایسا الٰہی سبزہ رنگوں کا
کہ چھنتی رہتی ہے آٹھوں پہر پرہیزگاروں میں

توڑ کر خُم اور پٹک کر اپنے پیمانے کو ہم
سوئے مسجد جاتے ہیں زاہد کے بہکانے کو ہم

زاہد کو ہوا پیدا پینے کا نیا چسکا کوزہ جو وضو کا تھا پیمانہ بنا ڈالا

جلوئے ساقیِ مے جان لئے لیتے ہیں شیخ جی ضبط کریں ہم تو پئے لیتے ہیں

مُنہ تک رہے ہیں حضرت، احباب پی رہے ہیں
کیا شیخ جی اب اس لئے دُنیا میں جی رہے ہیں

لُطف مے تُجھ سے کیا کہوں زاہد
ارے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

دب گئی پاندان میں چُٹکی
آگ لگ جائے پان کھانے کو

دل چھین لیا یار نے مُٹھّی میں بند ہے
کھُلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

دل تو لیتے ہو مگر دیکھ لو ٹوٹا پھوٹا
یہ نہ ہو کہیں پیچھے سے بکھیڑا نکلے

خطا ثابت کریں گے خوب اپنی انکو چھیڑیں گے
سُنا ہے ان کو غصّے میں لپٹ جانے کی عادت ہے

کروٹ بھی لینا ہجر میں دشوار ہو گئی
بستر پہ شکن جو پڑی تلوار ہو گئی

تم مریضِ عشق کی میّت پہ کاندھا تو نہ دو
پھر نئے سر سے نہ اُٹھ بیٹھے سہارا دیکھ کر

حشر میں حشر نہ برپا کرے یہ دیوانہ
اس لئے دفن کیا ہے اسے زنجیر کے ساتھ

دیدۂ تر سے جو آنسو مرے ٹپکے گرم گرم
آتے آتے بن گئے وہ میرے داماں پر چراغ

سُنا کرتا ہوں ساری رات لیکن کچھ نہیں کھلتا
دہانِ زخم کیا باتیں کیا کرتے ہیں مرہم سے

چڑھا منصور سولی پر پکارا عشق بازوں کو — گرا کے جان ہمیہ جا رہا ہوں بالیسی دیکھو

ہوا کو تھا درِ جاناں پہ حکمِ دربانی — غرض یہ تھی کسی عاشق کی روح آ نہ سکے

مسجد میں اُس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا — کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

پتھر پڑے صنم ترے ایسے پیار پر — مرنے کے بعد آئے ہیں رونے مزار پر

کبھی مسجد میں جو وہ شوخ پری زاد آیا — پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا
دی مؤذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات — ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

کل تو یہ کہتے تھے بستر سے اُٹھا جاتا نہیں — آج یہ طاقت ہوئی دونوں جہاں سے اُٹھ گئے

عجب ہے نعمتِ دُنیا سے لذتِ بوسۂ لب کی
وہ جوگی ہو گیا جس نے یہ موہن بھوگ چکھا ہے

سمجھ کر طالبِ بوسہ بگڑ کر بولے درباں سے
یہ کیوں آتا ہے، کہدو کیا یہاں خیرات بٹتی ہے؟

لگا جو دانت مرا لب پہ ہنس کے فرمایا   ہمارے بوسے نہ ٹھہرے کوئی غذا ٹھہری

لیا جو خواب میں بوسہ تو یار جاگ اُٹھا   تمام عُمر کا ہم اعتبار کھو بیٹھے

کیا نزاکت تھی کہ عارض ان کے نیلے پڑ گئے
میں نے تو بوسہ لیا تھا خواب میں تصویر کا

اے ابرِ نوبہار ذرا تھم کے برسنا   آجائے مرا یار تو پھر جم کے برسنا

ہوا ہوں اسقدر بیزار میں تیری جدائی سے
کہ چیونٹی کھینچ لے جاتی ہے مجھکو چارپائی سے

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں   ہنس کے فرمانے لگے بستر کو جھاڑا چاہئے

ناتوانی اسقدر چھائی ہے حالِ زار پر   چڑھ نہیں سکتا ہے سایہ بھی مرا دیوار پر

ناتوانی نے بچائی جان میری ہجر میں
کونے کونے ڈھونڈھتی پھرتی قضا تھی میں نہ تھا

اُس گلبدن کو چاہئے پھولوں کی پنکھیا　　بادِ صبا بھی سو رہی ہے کھا کے سنکھیا

لگادی آگ پانی میں نہا کر اُس بھبھوکے نے
حُبابوں کا نہیں جھُرمٹ تنِ دریا پہ چھالے ہیں

نگاہِ باڑھ پر سُرمہ کا مانجھا رکھ کے قاتل نے
ہوائے عشق سے کیا دل کے کنکوے کو کاٹا ہے

ٹیڑھی نظر سے دیکھے تو چھاٹا نکل پڑے　　کرتی تھیں کام یار کی آنکھیں گُلاب کا

نامعلوم



مُتفرّقات

محوِ خیالِ یار رہوں کام اور سے نہیں
ہوں آپ اپنے درد کا درماں لئے ہوئے
متوجہ مری سمت ہوئے بھی تو یوں کہا
اک جنبشِ دل ہے وہ بھی پریشاں لئے ہوئے

اے نگاہِ شوق اُٹھنا، دیکھنا، چلنا ذرا
پردۂ قدرت کے پیچھے کون پنہاں ہو گیا
بیخودی تھی، مستیاں تھیں، گرم تھی بزمِ شباب
ہوش کب آیا کہ جب چلنے کا ساماں ہو گیا

حضرت ظہور کانپوری

رباعی

خود پرستی خدا نہ بن جائے
احتیاطاً گناہ کرتا ہوں
دیکھ لیتا ہوں ہر طرف اکبر
کس تکلف سے آہ کرتا ہوں

رباعی

ضبط کرتا ہوں اپنی آہوں کو
دیکھتا ہوں تری نگاہوں کو
آہ افسردگی تقدس کی
یاد کرتا ہوں پھر گناہوں کو

حضرت اکبر حیدری

زندگی کیا ہے فقط وقت کا اچھا کٹنا
اور تمہید اجل روح کی راحت گھٹنا
سکۂ حسن بنایا گیا چلنے کے لئے
نہ کہ یوں آتشِ فرقت میں پگھلنے کے لئے

شمع بیکار ہے جب اس سے اُجالا نہ ہوا
حسن کس کام کا گر دیکھنے والا نہ ہوا

روح قالب سے پسِ مرگ جدا ہوتی ہے
کس کو معلوم کہاں جاتی ہے کیا ہوتی ہے

حالتیں کہتی ہیں یہ سوختہ سامانوں کی
دشمنِ انساں کی ہیں کمزوریاں انسانوں کی

زندگی وہ ہے جو ہنس کھیل کے خوش ہوکے کٹی
کیا کٹی عمر اگر غم میں کٹی رو کے کٹی

جب ہوا کرتی ہے یوں چاہ ہوا کرتی ہے
قلب سے قلب کو اک راہ ہوا کرتی ہے

غم ہے جو روح کی عظمت کا پتہ دیتا ہے
اور انسان کو انسان بنا دیتا ہے

حضرت رواںؔ اناؤی

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے

تابِ نظارہ نہیں آئنہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

آنکھ اسکی پھر گئی تھی دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا انقلاب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں　　پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں

حضرت مومن

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو　　یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے　　مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا　　جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

خدا نہیں جو عبادت سے کر لیا راضی　　بتوں کی شیخ جی مشکل مزاج دانی ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　دل بھی یارب کئی دیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

حضرت غالب

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا — موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتّھر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر — پر ترا نام تو اک شوق کا دفتر نکلا

سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹُک روتے روتے سو گیا ہے

گل و بلبل بہار میں دیکھا — ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا
جل گیا دل، سفید ہیں آنکھیں — یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا
جن بلاؤں کو میر سُنتے تھے — اُن کو اِس روزگار میں دیکھا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یاں دن کو جوں توں شام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

مُنہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بُجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مُفلس کا

تاب کس کو جو حالِ میرؔ سُنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

آخر کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

حضرت میرؔ

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر — وعدۂ دید چاہئیے زحمتِ انتظار کیا

گو نہیں جز ترکِ حسرت دردِ ہستی کا علاج — آہ وہ بیمار جو آزردۂ پرہیز ہے

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لیکے کوئی غافل ہو گیا

زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت — زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانیؔ — وجود دردِ مسلّم علاج نا معلوم

نہیں معلوم راہِ شوق میں بھی ہے کوئی منزل
جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہئیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

اک بوند لہو کی ہے تو یہ حال ہے دل کا — وہ موجِ تبسّم کہیں دریا نہ بنا دے

سوالِ دید پہ تیوری چڑھائی جاتی ہے
مجالِ دید پہ بجلی گرائی جاتی ہے

مرے قیاس کو اپنے تلاش میں کھو کر
مرے حواس کو دُنیا دکھائی جاتی ہے

حضرت فانی بدایونی

اپنا ہو کہ بیگانہ ہو سب سے فراموشی
ہاں اور پلا ساقی ہاں اور ہو بیہوشی

کھو جانے کو پا جانا کہتے ہیں محبت میں
اور یاد کے رہنے کا ہے نام فراموشی

مت پوچھ کہ کیا پایا میخانہ میں مے پی کر
یہ پوچھ کہ کیا دیکھا با عالمِ مدہوشی

ہٹاؤ تم نہ ہمارے مزار سے چادر
اسی میں لپٹی کہیں آرزو پڑی ہوگی

تمھیں بتاؤں نتیجہ مرے رُلانے کا
تمھیں خیال کرو کس کی پھر ہنسی ہوگی

ہر حال میں ہے عشق تمنّا لئے ہوئے
اور حسن ہر ادا میں تقاضا لئے ہوئے

کوئی تری جفا سے ہے بیزارِ زندگی
کوئی تیری جفا کا سہارا لئے ہوئے

ثابت قدم نہ رہتا کوئی عشق میں حنا
ہے زندگی اجل کا سہارا لئے ہوئے

جفائے چرخ کی رفتار پر فریاد کیا کرتے
خود اپنی ہمّتِ عالی کو ہم برباد کیا کرتے

روتے میں شامل ہنسی، ہنسنے میں رونا ہے شریک
بزمِ ہستی کی ہمیں تصویر دکھلاتی ہے شمع

شوخیِ پروانہ پر تو مسکراتی رہتی ہے
غیر گر چھیڑے تو فوراً آگ ہوجاتی ہے شمع

بیگانگیٔ دل کے افسانے کو کیا کہئے
اپنا نہ ہوا اپنا بیگانے کو کیا کہئے

جب دونوں ہی روشن ہیں اک تیری تجلّی سے
پھر کعبہ تو کعبہ ہے بتخانے کو کیا کہئے

آتے ہیں ستانے کو جاتے ہیں رُلانے کو
اس آنے کو کیا کہئے اس جانے کو کیا کہئے

اے مشعلِ بزمِ دل اے شمع حریمِ جاں
سب تجھ پہ تصدّق ہے پروانے کو کیا کہئے

رو رو کے ترا میرا دامن سے لپٹ جانا
اور اُنکا یہ فرمانا دیوانے کو کیا کہئے

ناشناسِ مدّعا ہوتے گئے
جیسے جیسے دلربا ہوتے گئے

دل جگر دونوں فنا ہوتے گئے
حق محبّت کے ادا ہوتے گئے

پورا ہو جو عاشق کا وہ ارمان ہی کیسا
جو دل سے نکل جائے وہ حسرت ہی نہیں ہے

جو اشک اِن آنکھوں سے گرا ہے ترے غم میں
اُس گوہرِ نایاب کی قیمت ہی نہیں ہے

جب دل سے نکالو تو یہی کہتی ہے حسرت
مہمان سے خالی یہ مکاں ہو نہیں سکتا

ہے دردِ جگر سوزِ محبت کی علامت
جب تک نہ لگے آگ دھواں ہو نہیں سکتا

پہونچ سکی نہ نظر تا بہ حدِ مانعِ درد — ہمیں یہ شکوہ رہا درد کی دوا نہ ملی
عدم کے وصف سے ہستی کا رنگ مل نہ سکا — ملا وجود کو سب کچھ مگر بقا نہ ملی

سر و سامانِ عمارت ہے ہوسِ دنیا کی — چاہتا ہوں میں تجھے بے سر و ساماں ہو کر

مکینِ دل نہ سمجھے پردہ دارِ لامکاں سمجھے
کہاں تھے تم مگر ہم کم نگاہی سے کہاں سمجھے
تمھارے نام کو ہم نے دوائے دردِ دل جانا
تمھارے ذکر کو ہم باعثِ تسکینِ جاں سمجھے
نہیں کچھ حاجتِ دیر و حرم الفت کے بندوں کو
جہاں بھی رکھدیا سر یار ہی کا آستاں سمجھے

حضرت حنا لکھنوی

گل نہیں تو بوے گل ہی سے معطر ہو دماغ — کوئی رکھ دیتا قفس میرا ہوا کے سامنے

غنیمت ہے قفس میں شاخِ گل کی تیلیاں بلبل
اسیری میں گلِ مقصود پاتا کون ہے بلبل

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

اگر دردِ محبّت سے نہ اِنساں آشنا ہوتا — نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
ہزاروں جان دیتے ہیں بتوں کی بیوفائی پر — اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پر — جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے — کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے
نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر — یہ بُت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے
ہوا مزاج کا عالم یہ سیرِ یورپ سے — کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے
زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا — خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے
یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں — قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

دل ہی بُجھا ہوا ہو تو لُطفِ بہار کیا — ساقی ہے کیا، شراب ہے کیا، سبزہ زار کیا
یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی — اِس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا، بہار کیا
جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح — اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

نئے جھگڑے، نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں — وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں
ہوا میں اُڑ کے سیرِ عالمِ ایجاد کرتے ہیں — فرشتے دنگ ہیں وہ کام آدم زاد کرتے ہیں
سبق عمرِ رواں کا دل نشیں ہونے نہیں پاتا — ہمیشہ بھولتے جاتے ہیں جو کچھ یاد کرتے ہیں

اُڑا کر صحنِ گلشن سے مٹا کر آشیاں میرا — مرے سایہ کے پیچھے پھر رہا ہے باغباں میرا

ے احباب پیش آتے ہیں مجھسے بیوفائی سے — وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

ٹنے والوں کو وفا کا یہ سبق یاد رہے — بیڑیاں پیر میں ہوں اور دل آزاد رہے

بکو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مری — کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیّاد رہے

حضرت چکبست

سرت ہوئی ہنس لئے دو گھڑی — مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے

حضرت اکبر

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر — کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں دیتے

حضرت انیس

بنیادِ آشیاں کو جو گھبرا کے رکھدیا — تنکوں کے بدلے برق کو لا لا کے رکھدیا

وارفتگیٔ شوق میں تصویرِ یار کو — دل سے لگا لیا کبھی گھبرا کے رکھ دیا

ہر بار یاس لائی ہمیں راہِ راست پر — ہر بار اک امید نے بھٹکا کے رکھ دیا

حضرت جنوں

مدرسہ یا دیر تھا کعبہ تھا یا بتخانہ تھا

ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

جیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اِک سبزۂ بیگانہ تھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

جوابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھُلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز لے درد درپے ہوں اُسکے
کسی نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقّا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے
اور دل میں بھروسہ ہے تو ہے تیرے کرم کا

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال تجھے منھ دکھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

حضرت میر درد

نہ ہوگی شفا چارہ گر دیکھ لینا — نہ جائے گا دردِ جگر دیکھ لینا
وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے — غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا
نہ بھولے گا وہ وقتِ رخصت کسی کا — مجھے مُڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا
وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں — وہ بھولے سے ان کا اِدھر دیکھ لینا

ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آ گئی تھی آج — سو کتنے شرمسار ہوئے بیکسی سے ہم
اللہ ری مزاج کی حسرت پرستیاں — گویا کہ آشنا ہی نہیں ہیں ہنسی سے ہم

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا — حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانہ
اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ — باقی ہے فقط عہد تمنا کا فسانہ

انکے خط کی آرزو ہے، اُنکی آمد کا خیال — کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں — آرزوں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے / وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد / ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد / جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت / اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی / اے یار ترا حسن شرابی

دل کو تری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے / اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے

جب لے کے گئی ہے ہمیں تا کوئے ملامت / مجبوریٔ دل خاک بسر لے کے گئی ہے

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی / اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو / پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھائیگی / اے حسنِ حیا پرور، شوخی بھی شرارت بھی

دیکھ اے ستمِ جاناں یہ نقشِ محبت ہیں

بنتے ہیں بہ دشواری، مٹتے ہیں بہ آسانی

قائم ہے ترے دم سے ہے طرزِ سخن قائم

پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگِ غزل خوانی

آپ کے ہاتھ سے کرم کہ ستم — جو ہوا مجھ پہ بے حساب ہوا

میں مبتلائے رنجِ وطن ہوں وطن سے دور — بُلبُل کے دل میں یادِ چمن ہے چمن سے دور
ہے ہجر بھی وصال رہے خوبیٔ خیال — بیٹھے ہیں انجمن میں تری انجمن سے دور
رعنائیٔ خیال کو ٹھہرا دیا گناہ — زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

منحصر وقتِ مقرّر پہ ملاقات ہوئی — آج یہ آپ کی جانب سے نئی بات ہوئی

حضرت سہوانی صاحب

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجکو بھی سمجھاتا جا
میری چپ چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا
نغمے سے جب پھول کھلیں گے، چُننے والے چُن لیں گے
سُننے والے سُن لیں گے تو اپنی دُھن میں گاتا جا

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے
رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی، برہمیِ مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست جسکی سمجھ میں آ سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

وہ نگہ باندھ گئی دل میں طلسمِ اُمیّد — نظر آتی ہے تمنّا ہی تمنّا ہم کو

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہوں میں، فریاد کر لیتا ہوں میں

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے خدا
ایک عادت ہے کہ تجھکو یاد کر لیتا ہوں میں

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سُہانا ہے
افسوس مجھے نیند آتی ہے افسوس مجھے سو جانا ہے

معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچّی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مُرجھانا ہے

بازارِ دنیا، گاہک بھی نئے اب جنسِ وفا کی قدر نہیں
بے سود نمائش رہنے دے اے دل یہ مال پُرانا ہے

لے چل ہاں منجدھار میں لے چل ساحل ساحل چلنا کیا
میری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

حفیظ صاحب جالندھری

یہاں تک ہوا ہے دل خراب محبّت
کہ آنکھوں سے چھلکے شرابِ محبّت
رگوں میں لہو سانس لیتا ہے گویا
اب اس حد پہ ہے اضطرابِ محبّت
صبا گنگنائی، فضا گونج اٹھی
جہاں دل نے چھیڑا ربابِ محبّت
رہے داغ ہو کر بہے خون ہو کر
اثر ہے وہ دل کامیابِ محبّت

کرن چاند کی گود میں سو رہی ہے
دمِ خواب ہے، دستِ نازک جبیں پر

نظر اس حسنِ تاباں تک بآسانی نہیں جاتی
مگر جا کر پلٹتی ہے تو پہچانی نہیں جاتی
ہوئی مدّت کہ اس نے ناز سے دامن کو جھٹکا تھا
ابھی تک موجۂ گل کی پریشانی نہیں جاتی
مری حسرت نہ پوچھو، شمعِ سوزاں کی طرف دیکھو
کہ ہے بے آشیاں لیکن پُرافشانی نہیں جاتی

ہوا میں کچھ دھواں سا اُٹھ کے فوراً پھیل جاتا ہے
قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیاں مجکو
میں اب سجدہ کروں، دل کو سنبھالوں یا بڑھوں آگے
نظر آتا ہے کوسوں سے کسی کا آستاں مجکو

حضرت اثر لکھنوی

گنگنا کر خود ہی جس دم وجد میں آتا ہوں میں
بارگاہِ عالمِ بالا پہ چھا جاتا ہوں میں
ہوش میں لاتا ہے پھر جب مجکو شورِ کائنات
اپنے دل میں اے خمار اک درد سا پاتا ہوں میں

حضرت خمار بارہ بنکوی

میں سمجھتا ہوں کہ ہوگا عشق کا انجام کیا
میں مریضِ عشق ہوں مجکو دوا سے کام کیا
شاہ شاہی کر گئے، بے زر گدائی کر گئے
ہنستے ہنستے کٹ گئی، یا روتے روتے کٹ گئی

حضرت واعظ کو اس حجت سے آخر کام کیا
میں سمجھتا ہی نہیں تکلیف کیا، آرام کیا
عشق کا کوچہ ہے اس میں نام کیا بدنام کیا
چار دن کی زندگی تکلیف کیا آرام کیا

یہی مٹ جائے تو قیدِ قفس کا درد مٹ جائے
پھنسا رکھا ہے اے بُلبُل تجھے شوقِ رہائی نے

ہاں اور پلا ساقی اک جام محبت کا — آنکھیں تری دیتی ہیں پیغام محبت کا
یہ رمزِ محبت ہے تشہیر میں شہرت ہے — بدنام نہیں ہوتا بدنام محبت کا

سزا دینے کو جو چاہیں وہ دے لیں جرمِ اُلفت کی
خطا انسان کرتا ہے خطا ہوتی ہے انساں سے

حضرت صابر بریلوی

ڈھونڈے تو نہیں ملتے ڈھونڈے سے کہیں تم — اور پھر یہ تماشہ کہ جہاں ہم ہیں وہیں تم
جب دل میں مرے رہتے ہو ہر وقت مکیں تم — بیگانہ بنو کتنے ہی بیگانہ نہیں تم
بس آو مری آنکھ میں اس طرح کہیں تم — جس سمت نظر جائے نظر آو تمھیں تم
جس روز ستم کرتے ہو تازہ کوئی دل پر — اُس روز زیادہ نظر آتے ہو حسیں تم

حضرت نشتر ہنگامی ادرئی

ترے غم سے بدل ڈالی زمانے کی خوشی میں نے
بنایا زندگی کو کامیابِ زندگی میں نے
بنا کر دردِ دل کو رہنمائے عاشقی میں نے
جہاں اُن کی خوشی دیکھی لُٹا دی زندگی میں نے

عجیب چیز ہیں مجبوریاں محبت کی — تڑپ رہے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں

نہ دیکھ چشمِ حقارت سے سوے میخانہ　　یہاں رموزِ حقیقت بتائے جاتے ہیں

حضرت انور

گئے وہ دن کہ جب تھی آرزوے رنگ و بو دل میں
میں اب اپنی نگاہوں میں لئے پھرتا ہوں گلشن کو

یہ دھڑکن قلب کی یہ دست و پا میں لرزشِ پیہم
یہ شاید ان کے کوچہ کی زمیں معلوم ہوتی ہے
تپ فرقت چھپاؤں گا کہاں تک چارہ سازوں سے
مجھے ہر نبض مارِ آستیں معلوم ہوتی ہے

ہے میرے شوقِ دید پہ طعنہ زنی غلط　　جلوہ ترا نقاب میں خود بیقرار تھا

ضعیفی مانعِ جذبات ہرگز ہو نہیں سکتی　　طبیعت کا بڑھاپا ہے طبیعت کی جوانی ہے

ڈگمگا نکلیں جہاں سے پاؤں، کھو جائیں حواس
بس وہیں سے حد شروع ہے کوچۂ دلدار کی

کیا گھر سے پاؤں اپنا نکالیں جنوں میں ہم — ہیں ایک عذرِ تنگیٔ صحرا لئے ہوئے

سلامت اس کی رحمت اور ندامت برقرار اپنی
کوئی دامن پہ ظاہر داغِ عصیاں ہو نہیں سکتا

ڈوبتے ہی ہو گیا آزادِ بحرِ زندگی
مل گیا ساحل اُسی جا جس جگہ ساحل نہ تھا
منظرِ صد بیکسی بھی دیکھنے والے نہ تھے
ہم بھی ڈوبے تو کہاں ڈوبے جہاں ساحل نہ تھا
چند موجیں درمیاں میں اُٹھ کے حایل ہو گئیں
ورنہ گردابِ بلا سے دور کچھ ساحل نہ تھا

فقط اس واسطے گن گن کے میں تنکوں کو رکھتا ہوں
کہ شاید برق آکر کچھ حسابِ آشیاں سمجھے

اگر اُٹھ جائیں راہِ عشق کی پابندیاں دل سے
تو منزل کیا، ابھی آگے نکل جاؤں میں منزل سے
رہِ اُلفت میں کچھ ایسا جنونِ شوق پیدا ہے
پہونچ کر ختمِ منزل تک پلٹ آتا ہوں منزل سے

جیسے اک ہار پھولوں کا سمجھ رکھا ہے دُنیا نے — وہ اک فہرست ترتیبی ہے رودادِ گلستاں کی

حضرت فارق متھرا

مزہ یہ ہے کہ جب ہم طاقتِ پرواز کھو بیٹھے
قفس نے کہہ دیا چپکے سے جا آزاد کرتا ہوں

وہاں ہوتے ہو تم بس دوسرا کوئی نہیں ہوتا
تمناؤں کی دُنیا دل میں جب آباد کرتا ہوں

ہوتا نہیں ہے کوئی بُرے وقت کا شریک — پتّے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دُور

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

اللہ رے شوقِ دید کہ پتھرا گئی ہے آنکھ — تصویر کر دیا ہے نگہ انتظار کو

پہروں سینے سے لگا کر میں یونہی روتا ہوں — آشیاں کا کوئی تنکا جو کہیں دیکھ لیا

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اے سمندر دیکھ لی ہم نے تری دریا دلی
تشنہ لب رکھا صدف کو ایک قطرے کیلئے

در بدر بکتا پھرے گا آبرو گھٹ جائے گی
چین سے موتی ہے جبتک دامنِ ساحل میں ہے

مختصر یہ ہے مرے غم کا فسانہ یارو
آسماں ایک ورق ہے مرے افسانہ کا

کاش کہ دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

گر دلگی نہ ہو تو جنت بھی خار ہے
پڑ رہنے کو تو گوشۂ تربت بھی کم نہیں

گزری ہوئی جوانی بیتی کہاں کہاں پر
کچھ میکدے میں گزری کچھ انکے آستاں پر

جس طرف جاتا ہوں تقدیر یہی کہتی ہے
آرزو کیوں لئے آتا ہے ادھر کچھ بھی نہیں

دل سے اٹھتی ہوئی موجیں جو چلی آتی ہیں
اٹھ کے پھر سب اسی دریا میں سما جاتی ہیں

اے عشق دیکھ ہم بھی ہیں کس دم کے آدمی　　مہماں بنا کے غم کو کلیجہ کھلا دیا

عبرت کا تقاضہ ہے کہ توبہ ہے ضروری　　رحمت کا اشارہ ہے ابھی اور خطا ہو

بیٹھا رہا میں سر کو جھکائے سرِ محفل　　پیاسوں کی قسم ایک بھی قطرا جو پیا ہو

لذتِ شرمِ گنہ بھی کب فرشتوں کو نصیب　　یہ مزہ چکھنے کو پیدا خلق میں آدم ہوا

کہنے کو مختصر ہے افسانہ زندگی کا　　لبریز ہو چکا ہے پیمانہ زندگی کا
مرنے کے بعد ساقی آئے گا کون پینے　　میکش کی زندگی ہے میخانہ زندگی کا
اے شمع تیری قسمت محفل میں جو جلی تھی　　پروانہ لیکے آیا نذرانہ زندگی کا
خونِ جگر سے لکھوں یا خونِ دل ہی لکھوں　　کہئے تو کس سے لکھوں افسانہ زندگی کا
آئی بھی ہے یہ خوش خوش جائیگی بھی یہ خوش خوش　　جب موت ہی سے ٹھہرا یارانہ زندگی کا

نامعلوم

